شمارہ اول، بہار 2020

ترقی پسند طلبہ اور نوجوانوں کی آواز

سہ ماہی

ہلّہ بول

سماج کو بدل ڈالو!

مقدر بدلنے کا وقت آ رہا ہے!

progressiveyouth.net

PROGRESSIVE YOUTH ALLIANCE

ترقی پسند طلبہ اور نوجوانوں کی آواز
سہ ماہی
ہلّہ بول
سماج کو بدل ڈالو!

ایڈیٹوریل بورڈ

عمر ریاض
سلمیٰ نذر
فضیل اصغر
رائے اسد

اپنے تعلیمی ادارے یا علاقے
میں موجود مسائل
اور اپنی آراء سے ہمیں آگاہ کیجیے۔

editor@progressiveyouth.net

فہرست

- اداریہ: کورونا وباء، آن لائن کلاسز اور بیروزگاری کا سیلاب
- کورونا وباء اور آن لائن کلاسز کا غیر موثر اجرا
- ناکام نظام اور نوجوان
- 2020: سرمایہ داروں کے ڈوبتے ہوئے نظام کے خلاف بغاوتوں کا سال
- فلسفہ کیوں پڑھنا چاہیے؟
- نوجوان قیادت اور طلبہ یونین کا تعلق
- پاکستان: طبقاتی نظام تعلیم اور نوجوانوں کا مستقبل
- ناسور (افسانہ)
- دی لیجنڈ آف بھگت سنگھ (فلم ری ویو)

> “فلسفیوں نے اب تک دنیا کی تشریح کی ہے، سوال اس کو بدلنے کا ہے۔”
>
> کارل مارکس

اداریہ: کورونا وبا، آن لائن کلاسز اور بیروزگاری کا سیلاب

اس وقت پوری دنیا ایک بڑی تباہی کی زد میں ہے لیکن اس کے اثرات امیروں اور غریبوں پر الگ الگ ہیں۔ ایک طبقاتی سماج میں قدرتی آفات اور وبائیں بھی کمزور کو نشانہ بناتی ہیں جبکہ محنت کشوں کا خون پسینہ لوٹ کر وسائل مجتمع کرنے والے ان آفات میں بھی خود کو محفوظ بنانے کی کوششوں میں اکثر کامیاب رہتے ہیں جبکہ محنت کش بے سروسامانی میں ان آفات کے رحم وکرم پر ہوتے ہیں۔

کورونا وبا کے پھیلاؤ کو روکنے کی خاطر پوری دنیا میں ایک لاک ڈاؤن کی صورتحال ہے۔ وائرس کے پھیلاؤ کو روکنے کی خاطر ایک کے بعد دوسرے ملک میں سکول، کالج، یونیورسٹیوں سمیت دیگر شعبوں اور کاروباری مراکز کو بند کر دیا گیا ہے۔ اس وبا کے باعث ہونے والی ہلاکتوں کی تمام تر ذمہ داری حکمران طبقات اور سرمایہ دارانہ نظام پر عائد ہوتی ہے جس نے نہ صرف یہ کہ منافع کی ہوس میں حقیقی تحقیق کا گلا گھونٹا بلکہ صحت کے بجٹوں میں کئی دہائیوں سے مسلسل کٹوتیاں کر کے لاکھوں انسانوں کی زندگیاں داؤ پر لگا دیں۔ تعلیم کا شعبہ بھی اس لوٹ مار سے مستثنیٰ نہیں اور اس پر بھی منافع خوری کے لیے مسلسل حملے کیے جاتے رہے ہیں جو ابھی بھی جاری ہیں۔ پاکستان کی حالت بھی انتہائی بدتر ہے جہاں صحت اور تعلیم کبھی بھی ان عوام دشمن حکمرانوں کی ترجیح نہیں رہی۔

کہنے کو تو لاک ڈاؤن ہے مگر تعلیم کا کاروبار جاری وساری ہے اور طلبہ سے فیسیں بٹورنے کا سلسلہ بھی نہیں رک سکا۔ بہت سے تعلیمی اداروں میں فیسیں بٹورنے کے لیے اچانک اور بغیر کسی تیاری کے آن لائن کلاسز کا لالی پاپ دیا گیا ہے جس سے طلبہ کی مشکلات میں کئی گنا اضافہ ہوا ہے۔ دوسری جانب کئی نجی سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں نے اساتذہ اور عملے کی تنخواہوں میں کٹوتیاں شروع کر دی ہیں یا ان کو سرے سے نکال باہر کیا ہے۔ دیگر شعبوں میں بھی ایسی ہی صورتحال ہے اور بہت سی صنعتوں اور اداروں سے بڑے پیمانے پر ملازمین کو نکالا جا رہا ہے جبکہ بہت سے ادارے بند بھی ہو رہے ہیں۔ کورونا وائرس اور سرمایہ دارانہ نظام کے عالمی مالیاتی بحران کے آغاز سے پوری دنیا میں بیروزگاری میں بھی بہت بڑے پیمانے پر اضافہ ہو رہا ہے جس کی انسانی تاریخ میں مثال نہیں ملتی۔ پاکستان میں بھی لاک ڈاؤن شروع ہوتے ہی لاکھوں نوجوان بیروزگار ہو چکے ہیں اور ابھی یہ محض آغاز کا بھی آغاز ہے۔

کورونا وبا کے نتیجے میں تعلیمی اداروں کی بندش نے نظام تعلیم کی بوسیدگی اور پسماندگی کا پردہ بھی چاک کر دیا ہے۔ تعلیمی اداروں کی بندش کے ساتھ ہی پہلے نجی یونیورسٹیوں اور بعد ازاں سرکاری یونیورسٹیوں نے بھی طلبہ کو ''مصروف'' رکھنے اور ان کا قیمتی وقت ''بچانے'' کے نام پر آن لائن کلاسز کے سلسلے کا آغاز کر دیا جو کہ مکمل طور پر ناکام ثابت ہوا ہے۔ زمینی حقائق سے مکمل طور چشم پوشی کرتے ہوئے بنا کسی تیاری کے اساتذہ کو آن لائن کلاسز منعقد کرنے کے احکامات جاری کر دیئے گئے۔ مقصد واضح تھا کہ کسی طرح لاک ڈاؤن اور بندش کے دوران طلبہ سے لاکھوں روپے فیسیں بٹورنے کا جواز پیدا کیا جائے تاکہ ان کے منافعوں میں کسی طور کمی نہ آئے اور تعلیم کا کاروبار چلتا رہے۔

دوسری طرف سرکاری یونیورسٹیوں کی جانب سے بھی آن لائن کلاسز کے اجرا کا مقصد اپنی آمدنی کو جاری رکھنا تھا تاکہ حکومت کی جانب سے تعلیمی بجٹ میں لگنے والی کٹوتیوں کا خمیازہ طلبہ سے پورا کیا جاسکے۔

مگر زمینی حقائق ان آن لائن کلاسز کی پوری کی پوری سرگرمی کا منہ چڑا رہے ہیں۔ایک ایسا ملک جہاں آبادی کی ایک بھاری اکثریت کو لاک ڈاؤن کے دوران دو وقت کی روٹی کے لالے پڑے ہوں وہاں بیک جنبش قلم آن لائن کلاسز کا اجرا ایک بھونڈا مذاق ہے۔اس کے خلاف پورے ملک کے طلبہ سوشل میڈیا پر صدائے احتجاج بلند کرتے نظر آئے جس کے نتیجے میں جزوی کامیابی بھی حاصل ہوئی اور کئی ایک یونیورسٹیوں نے آن لائن کلاسز کا سلسلہ روک کر سمیسٹر بریک کا اعلان کیا۔مگر تا حال بیشتر یونیورسٹیاں طلبہ کے احتجاج کے باوجود اس سلسلے کو جاری رکھنے پر بضد ہیں۔

آن لائن کلاسز یا فاصلاتی تعلیم کوئی نیا تصور نہیں اور پاکستان میں بھی علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اور ورچوئل یونیورسٹی جیسے ادارے فاصلاتی تعلیم دے رہے ہیں اور یہ ایک آگے کا قدم ہے۔مگر آن لائن کلاسز کے جدید طریقہ کار کے لیے درکار وسائل مہیا کرنا ریاست کی ذمہ داری ہے۔آن لائن لرننگ کے لیے جہاں ایک طرف اساتذہ اور طلبہ کی تربیت درکار ہوتی ہے تو دوسری جانب ای لائبریری، ورچوئل لیبارٹریاں اور دیگر وسائل لازمی ہیں جن کا پاکستان میں تصور ہی نہیں۔مزید برآں، ای لرننگ کے لیے سمارٹ فون یا لیپ ٹاپ کمپیوٹر کے ساتھ ساتھ تیز رفتار انٹرنیٹ کی دستیابی شرط اول ہے۔پاکستان جیسے پسماندہ ملک میں طلبہ تو دور کی بات اساتذہ کی بھاری اکثریت کے پاس بھی یہ وسائل دستیاب نہیں۔یوں یہ مسئلہ ایک طبقاتی مسئلہ بن کر ابھرتا ہے جہاں امیر طبقے سے تعلق رکھنے والے طلبہ تو آن لائن کلاسز سے مستفید ہوسکتے ہیں مگر طلبہ کی ایک بھاری اکثریت جو محنت کش یا نچلے درمیانے طبقے سے تعلق رکھتی ہے،اس کے لیے مزید مشکل، پریشانی، مالی دباؤ اور ذہنی اذیت کا باعث بنتا ہے۔

اس صورتحال سے واضح ہے کہ آنے والے وقت میں کورونا وبا کے کمزور پڑنے کے بعد جیسے جیسے زندگی بحال ہونا شروع ہوگی تو گہرے ہوتے معاشی بحران کے باعث پاکستان کا تعلیم دشمن حکمران طبقہ پہلے سے بڑھ کر تعلیم کے شعبے پر حملے کرے گا۔بہت سی یونیورسٹیوں کے ہاسٹلوں کو قرنطینہ بنا دیا گیا ہے اور یہ امکان موجود ہے کہ اب انہیں طلبہ سے ہمیشہ کے لیے چھین لیا جائے گا۔اسی طرح کورونا وبا سے پہلے ہی اعلیٰ تعلیم کے بجٹ میں پچاس فیصد تک کٹوتی کی گئی تھی جس کا نتیجہ فیسوں میں لاکھوں روپے اضافے کی صورت میں نکلا اور درمیانے طبقے کے لیے بھی تعلیم کا حصول مشکل سے مشکل تر ہو گیا تھا۔مگر یہ تو محض ٹریلر تھا۔آنے والے عرصے میں معاشی بحران کو جواز بناتے ہوئے حکمران طبقہ سرکاری سکولوں سے لے کر کالجوں اور یونیورسٹیوں تک، پورے شعبہ تعلیم کی نجکاری کی پوری کوشش کرے گا اور رہی سہی تعلیم کی سہولت بھی چھین کر لاکھوں نوجوانوں کو جہالت کے اندھیروں میں دھکیل دے گا۔ایسے میں آج مفت تعلیم اور طلبہ یونین بحالی کی جدوجہد پہلے سے کہیں بڑھ کر اپنی ضرورت کا اظہار کر رہی ہے۔جہاں یونیورسٹیاں آن لائن کلاسز کے نام پر فیسیں بٹورنا چاہتی ہیں تو نجی سکول اور کالج بھی پیچھے نہیں۔تمام نجی سکول اس آفت میں بھی اپنے منافعوں کی قربانی دینے کے بجائے والدین سے پوری فیسیں ادا کرنے کا مطالبہ کر رہے ہیں اور حکومت کہیں نظر نہیں آ رہی۔

یہ مہنگی ترین تعلیم ایک ایسے وقت میں فروخت کی جارہی ہے جب روزگار کے مواقع تیزی سے ختم ہورہے ہیں اور ملک میں بیروزگاری کا سیلاب امنڈ رہا ہے۔ پی ایچ ڈی کرنے والے افراد روزگار کے لیے غیر ہنرمند محنت کشوں کی معمولی ترین اجرتوں پر کام کرنے کے لیے تیار ہیں۔ ایک حالیہ سرکاری رپورٹ کے مطابق کورونا وبا کے نتیجے میں پاکستان میں دو کروڑ افراد بیروزگار ہوسکتے ہیں جو کہ کل لیبر فورس کا 20 فیصد بنتا ہے۔ مگر یہ اعداد و شمار بھی حقیقت کی درست عکاسی نہیں کرتے۔ پاکستانی ریاست کی پسماندگی کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ کسی بھی شعبے کے حوالے سے درست اعداد و شمار ہی دستیاب نہیں اور جو اعداد و شمار دیئے جاتے ہیں ان کا مقصد بھی حقیقت کو چھپانا ہوتا ہے۔ کورونا وبا سے پہلے ہی غیر سرکاری اندازوں کو مطابق پاکستان میں نوجوانوں میں بیروزگاری کی شرح 50 فیصد سے زائد بتائی جاتی تھی۔ اب اگر سرکاری اعداد شمار دو کروڑ لوگوں کے بیروزگار ہونے کا بتا رہے ہیں تو حقیقت کا اندازہ لگانا مشکل نہیں۔ اور ابھی یہ محض اندازے ہیں اور اصل صورتحال اس وقت سامنے آئے گی جب لاک ڈاؤن ختم ہونے کے بعد کئی ادارے، کمپنیاں اور صنعتیں دیوالیہ ہونے کے بعد لاکھوں نوجوانوں اور محنت کشوں کو بیروزگاری کی اندھی کھائی میں دھکیل دیں گی۔ یہ مظہر صرف پاکستان تک محدود نہیں اور بحران کی سنگینی کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ امریکہ میں صرف مارچ کے آخری دو ہفتوں میں ایک کروڑ افراد بیروزگار ہوچکے ہیں اور ریاست سے بیروزگاری الاؤنس کا مطالبہ کررہے ہیں۔ اور یہاں پاکستانی حکمران، دیہاڑی داڑوں کے لیے مگرمچھ کے آنسو بہاتے ہوئے سرمایہ داروں کو اربوں روپے کا ریلیف پیکج دے چکے ہیں۔ مگر بیروزگاری الاؤنس تو دور کی بات، حکومت چند ہفتوں کا راشن دینے میں بھی سنجیدہ نہیں۔

تعلیم کا کاروبار ہو یا بیروزگاری کا عفریت، آنے والے دنوں میں دونوں میں بڑے پیمانے پر اضافہ ہوگا۔ حکمران طبقہ ہمیشہ کی طرح بحران کا سارا بوجھ محنت کشوں پر ڈالنے کی کوشش کرے گا۔ مگر یہ لازمی نہیں کہ وہ اس میں کامیاب بھی ہو۔ یہ اس ملک کے لاکھوں نوجوانوں کی تقدیر ہرگز نہیں۔ طلبہ اور بیروزگار نوجوانوں کو یہ ادارک حاصل کرنا ہے کہ کورونا وبا تو محض ایک حادثہ ہے جس نے ایک لمبے عرصے سے سطح سے نیچے پنپنے والے تضادات کو پھاڑ دیا ہے اور ایک عالمی بحران کا آغاز ہوگیا۔ مگر اس سے پہلے بھی یہاں دودھ اور شہد کی نہریں نہیں بہہ رہی تھیں۔ آج سرمایہ دار اور ان کی حکومتیں اس نظام کو بچانے کے لیے ہر ممکن کوشش کررہی ہیں تاکہ ان کے منافع اور عیاشیاں جاری رہ سکیں۔ جب تک یہ طبقاتی نظام قائم رہے گا تعلیم کا کاروبار بھی یونہی چلتا رہے گا، فیسوں میں اضافہ جاری رہے گا اور بیروزگاری بھی بڑھتی رہے گی۔ یونہی کورونا جیسی وبائیں صحت کی ناکافی سہولیات کے باعث لاکھوں لوگوں کو موت کے منہ میں دھکیلتی رہیں گی۔ نوجوان ان غیر معمولی حالات سے شعوری اور لاشعوری طور پر نتائج اخذ کررہے ہیں۔ یہ ممکن نہیں کہ حکمرانوں کے تعلیم اور روزگار پر حملوں کیخلاف کوئی ردعمل نہیں آئے گا۔ مستقبل جدوجہد کے نئے دھماکوں سے لبریز ہوگا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان لڑائیوں کو اس طبقاتی نظام کے خلاف ایک فیصلہ کن لڑائی کے ساتھ جوڑا جائے اور سرمایہ دارانہ نظام کا ایک سوشلسٹ انقلاب کے ذریعے خاتمہ کیا جائے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اس نظام پر ایک فیصلہ کن ہلہ بولا جائے اور اس ظلم اور لوٹ کے رواج کو بدلا جائے۔ اس سماج کو بدلا جائے!

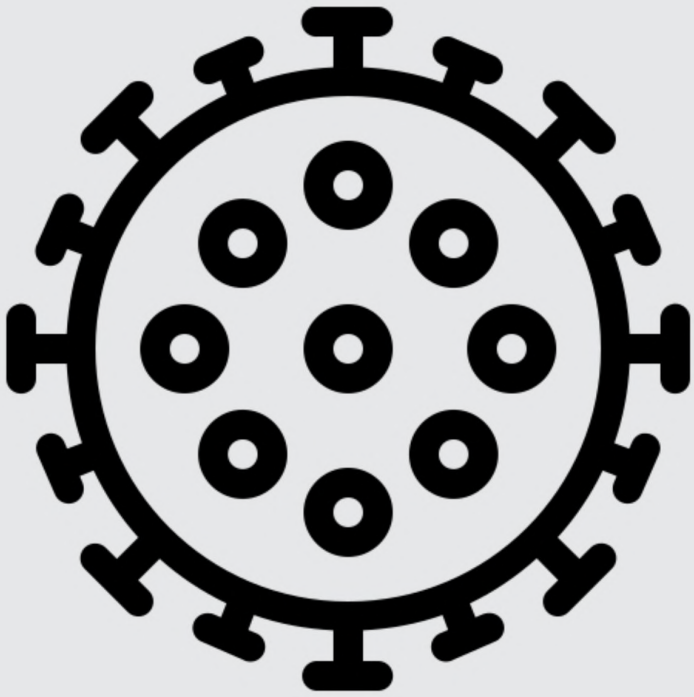

کورونا وباء اور آن لائن کلاسز کا غیرمؤثر اجرا

تحریر: عثمان ضیاء

کورونا وائرس کی وباء پھوٹنے پر ریاست نے فوری طور پر تعلیمی ادارے بند کرنے کا فیصلہ کیا، نتیجتاً تمام سرکاری اور پرائیویٹ جامعات بھی بند ہوگئیں۔ ہائر ایجوکیشن کمیشن نے جامعات کو یہ حکم دیا کہ فوری طور پر آن لائن کلاسز کا اہتمام کیا جائے جس پر ہر یونیورسٹی نے اپنے تئیں کوششوں کا آغاز کر دیا۔ صاحبانِ علم جانتے ہیں کہ اتنی قلیل مدت میں ہر یونیورسٹی کے لیے آن لائن کلاسز کا نظام بنانا، جانچنا اور نافذ کرنا بجائے خود ایک مشکل کام ہے لہٰذا بیشتر یونیورسٹیوں نے انٹرنیٹ پر دستیاب تیار ذرائع سے کام لینے کا فیصلہ کیا اور ایچ ای سی کو یقین دہانی کروادی کہ فوری طور پر آن لائن کلاسز کا اجراء کیا جا رہا ہے۔ اساتذہ کو آن لائن کلاسز کے لیے مواد مہیا کرنے کا حکم صادر ہوا اور طلبہ کو آن لائن کلاسز میں رجسٹر ہونے کا کہا گیا۔ غرضیکہ چند پرائیویٹ اور سرکاری یونیورسٹیوں میں یہ عمل شروع بھی ہو گیا جبکہ چند یونیورسٹیاں ابھی آن لائن کلاسز کا آغاز نہیں کر سکیں۔ اس تمام صورتحال میں ایک دلچسپ موڑ اس وقت آیا جب طلبہ نے آن لائن کلاسز کے خلاف آواز اٹھانا شروع کر دی اور انٹرنیٹ پر کئی آن لائن پیٹیشنز گردش کرنے لگیں جن پر دیکھتے ہی دیکھتے ہزاروں طلبہ نے برقی دستخط ثبت کر دیے علاوہ ازیں #WeRejectOnlineEdu اور #We_Want_Semester_Break کے رجحانات ٹوئٹر پر تیزی اختیا کرنے لگے۔

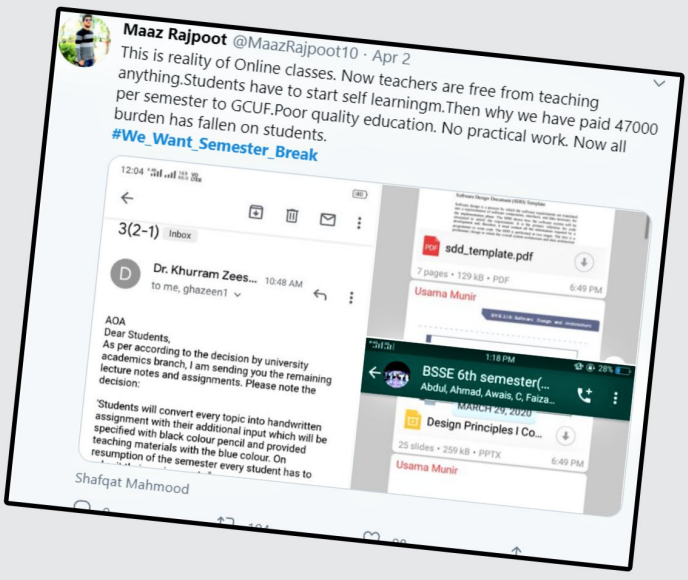

آیئے اس مسئلے کا تفصیلی جائزہ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کے تدریسی استعمال کا تصور نیا ہے اور نہ ہی اجنبی بلکہ جدید دنیا میں تدریسی عمل کو مؤثر بنانے کے لیے انفارمیشن ٹیکنالوجی کا استعمال کئی سطح پر کیا جا رہا ہے۔ لیکن اس کی اہمیت کا اقرار یا انکار کرنے سے پیشتر زمینی حقائق کو نہ صرف سمجھنا ضروری ہے بلکہ پاکستان جیسے ممالک میں بیک جنبشِ قلم اس نظام کے نفاذ سے پیدا ہونے والی صورتحال کا تجزیہ انتہائی ضروری ہے۔

قصہ کچھ یوں ہے کہ آن لائن تدریس پر کام کرنے والے محققین اور کاروباری کمپنیاں علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی کے فاصلاتی نظام تعلیم کو بنیاد بناتے ہوئے عموماً یہ دعویٰ کرتے دکھائی دیتے ہیں کہ پاکستان برقی فاصلاتی تعلیم کے لیے ایک بڑی تجربہ گاہ ثابت ہوسکتا ہے کیونکہ کم و بیش تیرہ لاکھ لوگ پہلے ہی اس فاصلاتی نظام تعلیم سے بظاہر استفادہ کررہے ہیں۔ کچھ محققین نے اس امر کو کھول کر دیکھنے کی کوشش بھی کی ہے، میرے زیر مطالعہ ایک تحقیق کے مطابق پاکستان میں اگر آئن لائن تدریسی نظام کو عام حالات میں اگر نافذ کیا جائے تو اس میں تین بڑے چیلنجز درپیش ہوں گے جن میں پہلا اساتذہ کی اس عمل کے لیے تیاری، دوسرا طلبہ کی تیاری اور تیسرا اداروں کی تیاری ہے۔ اداروں کی تیاری کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ جیسے ہی ایچ ای سی نے آن لائن کلاسز کے اجراء کا حکم جاری کیا، بیشتر یونیورسٹیوں کے پاس زمینی ضروریات کے مطابق اپنا کوئی نظام موجود نہیں تھا لہٰذا سب نے انٹرنیٹ پر دستیاب کسی نہ کسی نظام سے کام چلانے کی کوشش کی جس کا نتیجہ طلبہ کی جانب سے احتجاج کی صورت میں برآمد ہوا۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ طلبہ کا یہ برقی احتجاج اپنی وجوہات کی وضاحت بھی بخوبی کررہا ہے۔ اکثر طلبہ نے بہت واضح الفاظ میں یہ لکھا ہے کہ نہ صرف یہ کہ طلبہ کی ایک بہت بڑی تعداد کے پاس تیز رفتار انٹرنیٹ کی سہولت موجود نہیں بلکہ جن کے پاس انٹرنیٹ موجود ہے ان کے لیے بھی یہ آن لائن کلاسز غیر مؤثر ہیں کیونکہ یونیورسٹیاں جو دستیاب ذرائع استعمال کررہی ہیں وہ انتہائی بنیادی نوعیت کے ہیں اور صارفین کو وہ تمام سہولیات مفت مہیا نہیں کرتے جن سے عام کمرہ جماعت میں کی جانے والی سرگرمیاں آن لائن کی جاسکیں مثلاً براہ راست سوال و جواب، عملی سرگرمیاں وغیرہ۔ علاوہ ازیں اساتذہ کی ایک بڑی تعداد کے پاس آئن لائن کلاسز کی مطلوبہ تربیت موجود نہیں ہے جو عام طور پر آن لائن تدریس کے عمل کو سست اور غیر دلچسپ بنا دیتی ہے۔ انٹرنیٹ کی عدم دستیابی کے علاوہ ایک اور بڑا مسئلہ یہ ہے کہ آن لائن کلاسز میں شریک ہونے کے لیے کمپیوٹر کی ضرورت ہوتی ہے جو کہ تمام طلبہ کے پاس موجود نہیں۔ آن لائن کلاس کسی بھی صورت صرف سمارٹ فون پر نہیں لی جاسکتی کیونکہ کلاس میں کی جانے والی سرگرمیوں میں تفویضات و امتحانات کے لیے کمپیوٹر ہی کارآمد ہوتا ہے لہٰذا یہ دلیل درست نہیں ہے کہ آج کل اکثریت کے پاس سمارٹ فون ہے جو ہر کام کردیتا ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ سمارٹ فون ہر وہ کام نہیں کرسکتا جو آن لائن کلاسز میں کیا جاتا ہے۔ احتجاج کی ایک اور بڑی وجہ طلبہ یہ بیان کررہے ہیں کہ ان سے بھاری بھرکم فیسیں وصول کرنے کے بعد یونیورسٹیاں ایک ناقص آن لائن کلاسز کے نظام کے اجراء سے صرف اور صرف اپنا منافع بچانے اور اگلے سمسٹر کی فیسیں وصول کرنے کی تگ و دو کررہی ہیں۔ طلبہ واشگاف الفاظ میں یہ بات کررہے ہیں کہ آن لائن تدریس کا یہ عمل غیر مؤثر ہے کیونکہ کسی بھی یونیورسٹی نے یہاں کے زمینی حقائق کو مدنظر نہیں رکھا بلکہ بیک جنبش قلم ایک ناقص نظام کا نفاذ کرکے صرف اپنے منافع بچانے کی کوشش کی ہے جس میں نجی یونیورسٹیاں پیش پیش ہیں۔ دوسری جانب اگر سرکاری یونیورسٹیوں کی بات کی جائے تو ان میں طلبہ کی بھاری اکثریت غریب طلبہ پر مشتمل ہے جن کے پاس یا تو انٹرنیٹ میسر نہیں یا کمپیوٹر موجود نہیں۔ مسئلے کی گھمبیرتا کا اندازہ لگانے کے لیے ہم ایک مثال سے کام لیں گے، چند سرکاری یونیورسٹیوں نے آن لائن کلاسز کے لیے گوگل کلاس روم کا استعمال کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ گوگل کلاس روم میں اساتذہ تدریسی مواد کو اپلوڈ کرتے ہیں جسے رجسٹر کرنے والے طلبہ رسائی حاصل کرسکتے ہیں، اساتذہ کوئی ایک

دستاویز اپلوڈ کرنے کے بعد عموماً طلبہ کو یہ ہدایت دیتے ہیں کہ اس دستاویز کا مطالعہ کریں اور تفویض کیے جانے والے کاموں کو مطلوبہ وقت میں مکمل کر کے جمع کروائیں یا پھر برقی کوئز میں شامل ہوں۔ گوگل کلاس روم کے اندر کسی بھی موضوع پر Realtime تدریس یا رہنمائی کی براہ راست سہولت موجود نہیں ہوتی لہٰذا اس کام کے لیے اساتذہ یوٹیوب پر ویڈیو بنا کر اپلوڈ کرتے ہیں یا یوٹیوب لائیو کا استعمال کرتے ہوئے براہ راست تدریس کا کام سرانجام دیتے ہیں اور ان دونوں صورتوں میں طلبہ کا اساتذہ سے حقیقی رابطہ معطل رہتا ہے۔ طلبہ یہ بھی بتا رہے ہیں کہ اساتذہ عموماً یوٹیوب پر ویڈیو بنا کر اپلوڈ کرنے یا براہِ راست آنے کا تکلف کیے بغیر صرف برقی دستاویز اور سوالنامے اپلوڈ کرنے پر ہی اکتفا کر رہے ہیں جو اس سارے عمل کو مزید غیر مؤثر بناتا ہے۔ آن لائن کلاسز پر مشتمل فاصلاتی نظام تدریس پر ایک دم منتقل ہو جانے سے پہلے نہ ہی ایچ ای سی نے اور نہ ہی یونیورسٹیوں نے یہ سوچا کہ کیا ہمارے پاس مطلوبہ ذرائع میسر ہیں بھی یا نہیں۔ علاوہ ازیں جہاں تک تدریس کے لیے انفارمیشن ٹیکنالوجی کے استعمال کا تعلق ہے اس کے لیے مطلوبہ ذرائع اور وسائل کا موجود ہونا، اساتذہ و طلبہ کا تربیت یافتہ ہونا اور استعمال کیے جانے والے ٹولز کا صارف دوست ہونا بہت ضروری ہے اور فی الوقت ان تینوں شرائط میں سے ایک بھی پوری ہوتی نظر نہیں آ رہی۔ علاوہ ازیں ایسے مضامین جن کے لیے لیبارٹریوں یا عملی کام کی ضرورت ہوتی ہے ان کے لیے متبادل ورچوئل لیبارٹریاں تیار کرنا، جانچنا اور جاری کرنا ہنگامی حالات میں ممکن نہیں۔

اس سارے بکھیڑے میں ایک اور امر بالکل واضح ہے کہ وہ طلبہ جن کے پاس کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کی سہولت میسر نہیں وہ یقیناً آن لائن تدریسی عمل سے استفادہ نہیں کر سکیں گے اور نتیجتاً ناکام قرار پائیں گے جس کا واضح مطلب یہ ہوگا کہ انہیں یا تو تعلیمی عمل معطل یا ختم کرنا پڑے گا یہ پھر دوبارہ فیسیں ادا کر کے نئے سرے سے یہ کورسز پڑھنے پڑیں گے اور یہ اضافی مالی بوجھ طلبہ اور ان کے والدین کے لیے موجودہ معاشی صورتحال کو مشکل تر بنا دے گا۔

ان تمام امور کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں کہ موجودہ حالات میں بغیر مطلوبہ وسائل کی دستیابی اور فراہمی کے یہ توقع کرنا عبث ہے کہ آن لائن تدریس کا یہ عمل کسی بھی طرح سے سودمند ہوگا۔نجی یونیورسٹیوں کے لیے یہ فیس وصولی جاری رکھنے کا ایک بہانہ ہے۔ایسی صورتحال میں یہ مطالبہ حقائق سے عین مطابقت رکھتا ہے کہ آن لائن تدریس کے عمل کو فی الوقت معطل کرتے ہوئے طلبہ کو عارضی سمسٹر بریک دی جائے اور اس سمسٹر بریک کے دوران نجی اور سرکاری یونیورسٹیوں کو فیس وصولی روکنے کا حکم دیا جائے تاکہ طلبہ اور ان کے والدین کو مالی اور نفسیاتی بوجھ سے چھٹکارا دلایا جاسکے۔اگر یہ تجربہ جاری رکھنا اتنا ہی ضروری ہے تو طلبہ کی اس سمسٹر کی فیس اور دیگر اخراجات مکمل طور پر ختم کیے جائیں یا پھر حکومت ان کی ذمہ داری لے۔

اس کے علاوہ کورونا وباء کے تناظر میں یونیورسٹیوں کے لیے لازمی قرار دیا جائے کہ وہ وسائل کی موجودگی کا سروے منعقد کرتے ہوئے حقائق وضروریات کا تعین کریں اور پاکستانی طلبہ کی ضروریات کے مطابق مقامی سطح پر آن لائن تدریس کے نظام کو نہ صرف جلد از جلد تشکیل دیں بلکہ اسکی ضروری جانچ پڑتال مکمل کر کے نافذ کریں۔حکومت ایسے کسی بھی نظام کے نفاذ سے پیشتر یہ بات یقینی بنائے کہ طلبہ کو بغیر کسی اضافی بوجھ کے مفت تیز رفتار انٹرنیٹ کی سہولت پورے پاکستان میں مہیا کی جائے اور تمام طلبہ کو فوری طور پر کمپیوٹر اور دیگر مطلوبہ سہولیات مفت مہیا کی جائیں۔علاوہ ازیں تمام نجی یونیورسٹیوں کو مستقل قومی تحویل میں لیتے ہوئے فیسوں کے خاتمے کا اعلان کیا جائے اور تعلیم کو بنیادی اور اعلیٰ سطح پر مستقل طور پر مفت کیا جائے کیونکہ مفت تعلیم حق ہے، رعایت نہیں۔

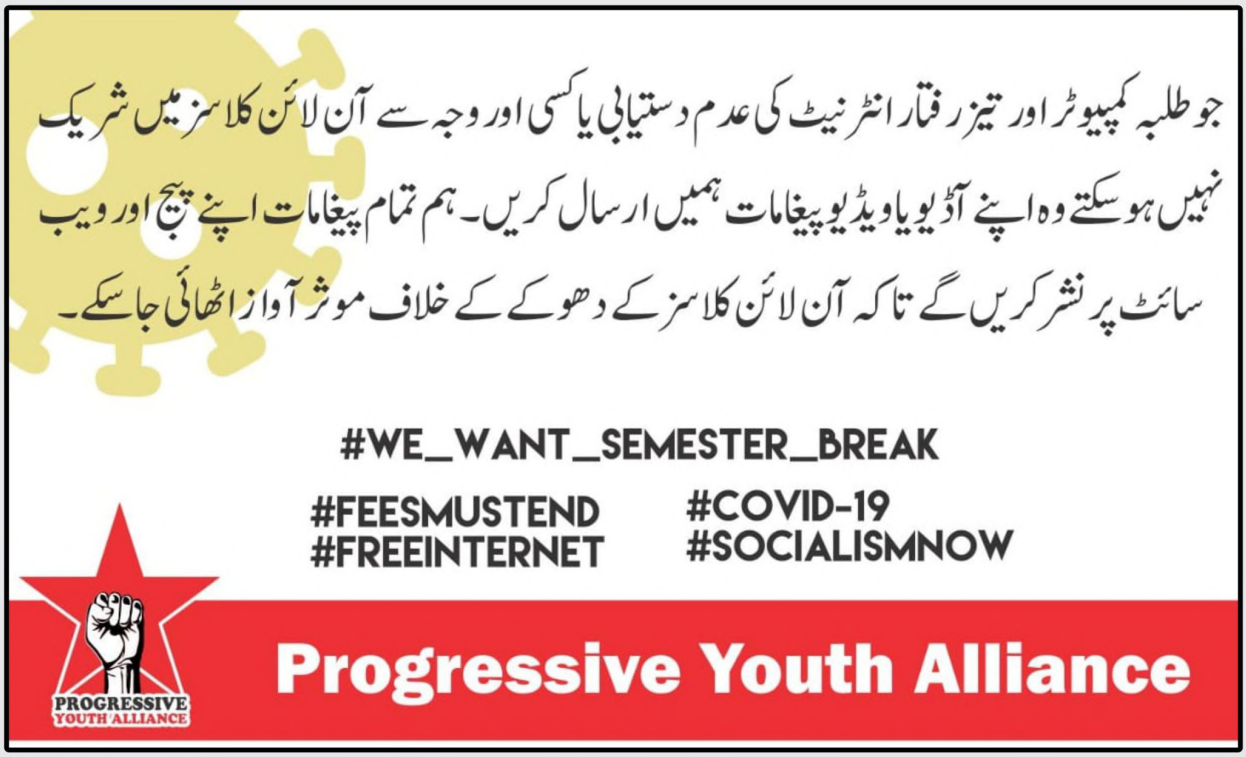

#NoOnlineClassesWithoutResources

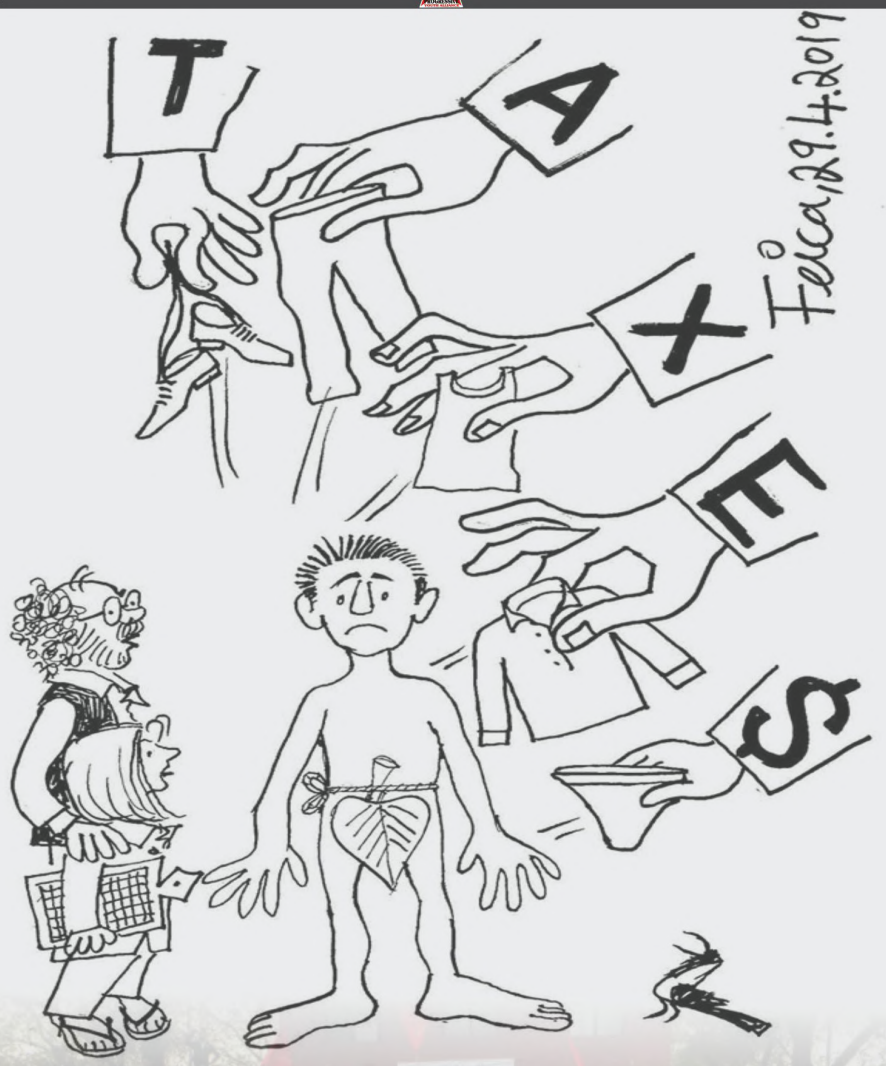

ناکام نظام اور نوجوان

تحریر: آصف لاشاری

پاکستان میں سیاسی بحران جس حد تک پہنچ گیا ہے اور جس طرح کا سیاسی خلا آج پاکستان میں موجود ہے، شاید ہی پاکستان کی تاریخ میں پہلے کبھی سیاسی بحران اس سطح تک گیا ہو۔ آج پاکستان کے حکمران طبقے کے پاس اپنے نظام کو کسی نہ کسی طرح چلائے رکھنے کے لیے درکار کوئی سیاسی قوت موجود نہیں ہے۔ سیاسی منظر نامے پر موجود تمام سیاسی جماعتیں عوامی حمایت اور ساکھ کھو چکی ہیں اور بسترِ مرگ پر جا پہنچی ہیں۔ کٹھ پتلیوں کی بیساکھیوں کے سہارے نظام کو چلانے کا تجربہ بری طرح سے ناکام ہوا ہے۔ میڈیا کی طاقت اور سرمائے کی قوت کے بلبوتے پر عوامی رائے تبدیل کرنے والے کنگ میکرز اور اس ریاست کے اصلی مالک اپنے پراجیکٹ کی تیز ترین ناکامی کے بعد سے ایک المناک صدمے کی کیفیت میں ہیں۔ ہڈی چھوٹی ہو جانے کی وجہ سے حکمرانوں کے درمیان لڑائی شدید ہو چکی ہے اور سب کے سب عوام کے سامنے تیزی سے ننگے ہو رہے ہیں۔ آج بحران کی وجہ سے ''مل جل کر کھانے'' کے دن ختم ہو چکے ہیں اور حکمرانوں کی یہ لڑائی مستقبل میں مزید شدت اختیار کرے گی۔ جس کے نتیجے میں وہ عوام کے سامنے مزید ننگے ہوں گے۔ پاکستان کے حکمران طبقے کی جانب سے غریب عوام پر مسلسل جاری رہنے والے معاشی حملوں نے ان کے شعور پر بہت گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ پچھلے عرصے میں عوام نے اس نظام اور حکمران طبقے کے کردار کے بارے میں اہم اسباق حاصل کیے ہیں اور آنے والے عرصے میں سماج کی مختلف پرتوں کی جانب سے ان حکمرانوں اور ان کے نظام کے خلاف احتجاجوں میں تیز ترین اضافہ ہونے کی طرف جائے گا۔

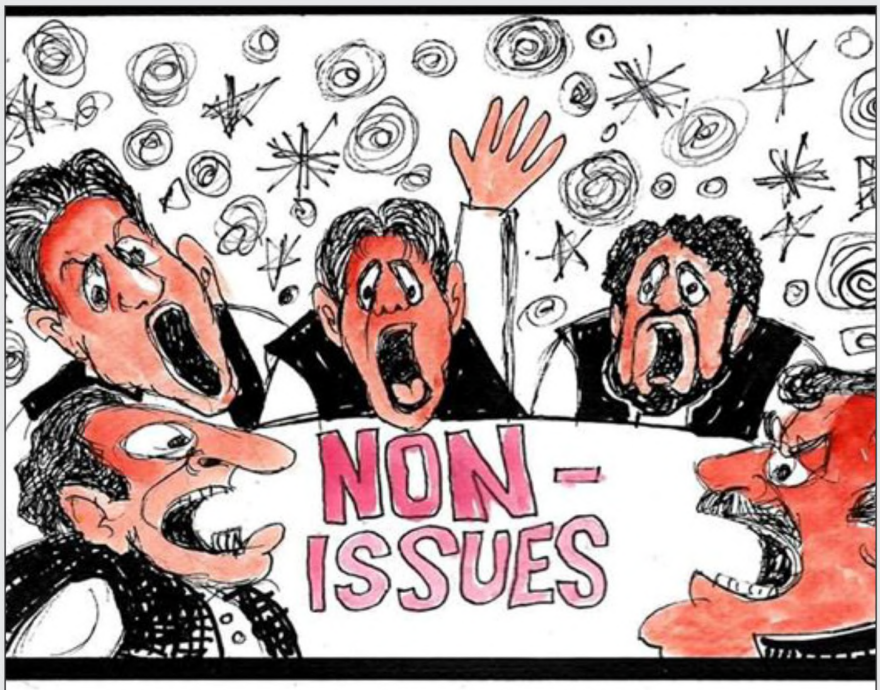

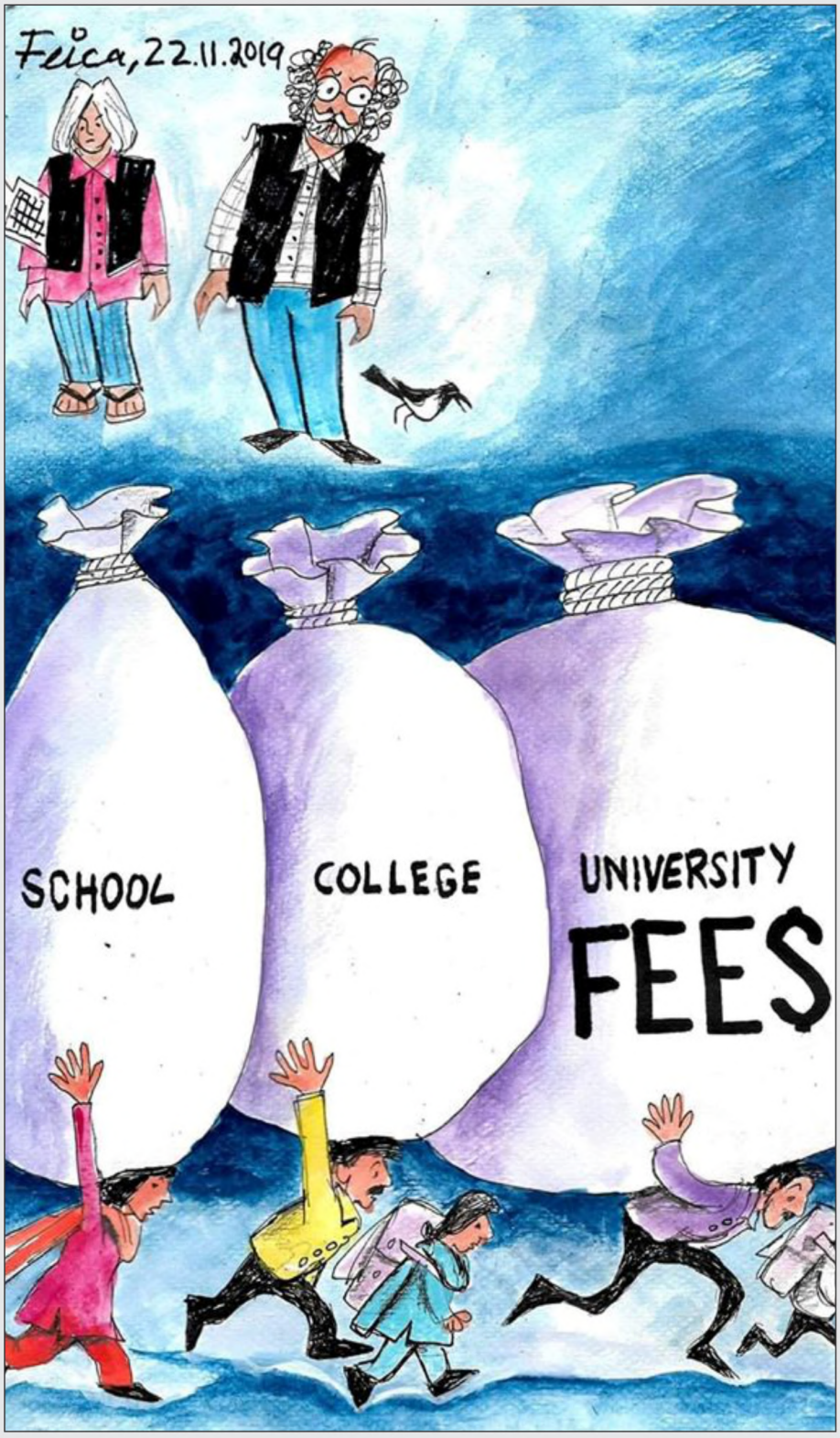

پاکستان کی ساٹھ فیصد سے زیادہ آبادی نوجوانوں پر مشتمل ہے اور اس نظام میں ان نوجوانوں کو بہتر مستقبل دینے کی گنجائش ختم ہو چکی ہے۔ ماضی میں بھی پاکستان میں نظام کے بحران اور حکمران طبقے کی نااہلی، کرپشن اور لوٹ مار کا بوجھ مسلسل محنت کش عوام پر منتقل کیا جاتا رہا ہے اور اب عالمی مالیاتی اداروں کے احکامات پر اس عمل کو تیز کر دیا گیا ہے۔ موجودہ حکومت نے ٹیکسوں میں اضافے سے کر مصنوعات کی قیمتوں میں اضافے تک انتہائی ظالمانہ اقدامات اٹھاتے ہوئے عوام کی اکثریت کو غربت کی اتھاہ گہرائیوں میں دھکیل دیا ہے۔ ہائیر ایجوکیشن کے بجٹ میں کٹوتی کرتے ہوئے فیسوں میں بے پناہ اضافہ کر کے غریب طالب علموں پر اعلیٰ تعلیم کے دروازے بند کیے جا رہے ہیں۔ نوجوانوں کی ایک بڑی اکثریت ڈگریاں ہاتھوں میں لیے روزگار کے حصول کے لیے دھکے کھانے پر مجبور ہے۔ دنیا بھر میں ہونے والے واقعات اور نوجوانوں کے اپنے حالات ان کے شعور میں تبدیلی لا رہے ہیں۔ نوجوانوں کے شعور میں تبدیلی کا اظہار ہمیں پچھلے عرصے میں طلبہ کی جانب سے احتجاجوں میں بہت زیادہ اضافے کی صورت میں نظر آیا ہے۔ گلگت سے لے کر بلوچستان تک ہر جگہ طلبہ کے بڑے بڑے احتجاج دیکھنے میں آئے ہیں۔ طلبہ میں موجود سیاست سے عدم دلچسپی کا عمل اب اپنے الٹ میں بدل چکا ہے اور طلبہ و نوجوانوں کے اندر خود کو منظّم کرنے اور سیاسی عمل میں شمولیت کی جستجو میں کئی گنا اضافہ ہوا ہے۔

طلبہ یونین کی بحالی کے حوالے سے طلبہ کے اندر ایک سنجیدہ بحث موجود ہے اور طلبہ کی اکثریت طلبہ یونین کی بحالی چاہتی ہے۔طلبہ یونین کی بحالی اور طلبہ کے دیگر مسائل کے حوالے سے پروگریسو یوتھ الائنس نے پچھلے سالوں میں بہت سے اہم کردار ادا کیا ہے اور ملک بھر میں منعقد ہونے والے کنونشن، سیمینار اور کیمپوں کے ذریعے ان تمام بحثوں کو طلبہ کی اکثریت تک لے جانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ نیچے سے بڑھتے ہوئے اسی پریشر کی وجہ سے ہمیں ابھی حکومتی ایوانوں میں طلبہ یونین کی بحالی کی قراردادوں کی کارستانیاں دیکھنے میں آئی ہیں۔

ملک بھر میں ہونے والے ماضی کے احتجاج یا تو خود رو تھے جن کی قیادت کوئی ماضی کی طلبہ تنظیم نہیں کر رہی تھی، یا یہ احتجاج قوم پرست طلبہ تنظیموں یا خود کو غیر سیاسی کہلوانے والی قوم پرست طلبہ کونسلوں کے غلبے میں رہے ہیں۔ ماضی میں ابھرنے والے احتجاجوں میں پیٹی بورژوا (Petit Bourgeois) عناصر و نظریات کے غلبے کی وجہ سے یہ احتجاج ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہے اور تحریک کی صورت اختیار نہیں کر سکے لیکن مستقبل قریب میں ابھرنے والی طلبہ تحریک معیاری اور مقداری دونوں حوالوں سے کہیں زیادہ بلند سطح کی ہوگی۔ پیٹی بورژوا عناصر اور قوم پرست قیادتوں کے رجعتی سیاسی پروگرام مستقبل میں ابھرنے والی طلبہ تحریک کو کوئی راستہ دکھا سکنے کی صلاحیت سے محروم ہیں اس لیے نوجوان سیاسی جدوجہد میں اترتے ہی ان سب کو اٹھا کر تاریخ کے کوڑادان میں پھینک دیں گے۔

طلبہ یونین پر پابندی لگنے کے بعد تعلیمی اداروں میں ابھرنے والی نام نہاد غیر سیاسی مذہبی تنظیمیں اور قومی ثقافتی کونسلیں اب اپنی طبعی عمر پوری کر چکی ہیں اور آج کی تبدیل شدہ معروضی صورتحال میں ان کی کوئی گنجائش باقی نہیں بچی ہے۔ان کونسلوں میں موجود نوجوان پچھلے چند سالوں کے تجربے سے یہ حقیقت جان چکے ہیں طلبہ کو درپیش مسائل کے خلاف جدوجہد الگ الگ رہ کر نہیں بلکہ نظریاتی بنیادوں پر متحد ہو کر لڑی جا سکتی ہے۔اسی لیے مستقبل میں ان کونسلوں میں موجود طلبہ کی باشعور پرتیں اس سارے عمل میں سوشلسٹ نظریات اور انقلابی سیاسی جدوجہد کا حصہ بننے کی طرف جائیں گی۔

پاکستان میں موجود سیاسی خلا کو مصنوعی طور پر اپنے نکمے لاڈلوں (جمعیت) کو لانچ کر کے پُر نہیں کیا جا سکتا اور بہت جلد اس سیاسی خلا کو دیوہیکل عوامی انقلابی تحریکیں پُر کرنے کی طرف جائیں گی اور پوری دنیا کی طرح پاکستان میں بھی نوجوان طلباء و طالبات ان تحریکوں میں ہراول کردار ادا کریں گے۔اسی لیے آج ضرورت ہے کہ نوجوانوں کو انقلابی نظریات سے لیس کیا جائے اور انہیں آنے والے عہد کے طوفانی واقعات کے لیے تیار کیا جائے۔

نوجوانوں کو سمجھنا ہوگا کہ تمام مسائل کی اصل وجہ موجودہ نظام ہے اور یہ نظام ان کو کسی قسم کا محفوظ مستقبل دینے کی اہلیت نہیں رکھتا ہے۔

نوجوانوں کو سمجھنا ہوگا کہ یہ نظام مٹھی بھر سرمایہ داروں اور ان کے نمائندہ حکمران طبقات کے منافعوں اور مفادات کے لیے کام کرتا ہے اور محنت کش عوام کا استحصال کرتا ہے۔موجودہ تمام سیاسی جماعتیں ظالم کرپٹ اور عوام دشمن ہیں اور یہ سرمایہ دار طبقے کی نمائندگی کرتی ہیں۔

طالب علموں اور نوجوانوں کو ان سے کسی قسم کی بہتری کی توقعات نہیں رکھنی چاہئیں اور غربت، بے روزگاری، لاعلاجی اور مہنگی تعلیم کے خلاف خود انقلابی جدوجہد کرنی چاہیے۔

پروگریسو یوتھ الائنس مسلسل کئی سالوں سے طالب علموں اور نوجوانوں کو ملک بھر میں انقلابی جدوجہد میں منظّم کر رہا ہے اور ان کی انقلابی سیاسی تربیت کر رہا ہے۔ ہم نوجوانوں کو اپنے پلیٹ فارم پر آنے اور انقلابی سیاسی جدوجہد میں ہمارے ساتھ شریک ہونے کی دعوت دیتے ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ یہ نوجوانوں کی انقلابی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے حقوق اور جبر و استحصال کے خلاف جدوجہد میں شریک ہوں اور اس دنیا کو بہتر بنانے کی جدوجہد میں اپنا کردار ادا کریں۔

2020

سرمایہ داروں کے ڈوبتے ہوئے نظام کے خلاف

بغاوتوں کا سال

تحریر: فرحان رشید

سال 2020ء میں ساری دنیا مکمل طور پر عدم استحکام کا شکار ہے اور اس کی بنیادی وجہ سرمایہ دارانہ نظام کا نامیاتی بحران (Organic Crisis) ہے۔ چند سال پہلے تک جو ریاستیں ترقی اور خوشحالی کیلئے بطور مثال پیش کی جاتی تھیں آج غربت، بیروزگاری اور دیگر مسائل میں گھری ہوئی ہیں۔ ورلڈ بینک کے اعداد و شمار کے مطابق آج دنیا کی 8.6 فیصد آبادی شدید غربت (Extreme Poverty) کی لکیر سے بھی نیچے جی رہی ہے اور 104 ترقی پذیر ممالک میں تقریباً 1.3 ارب لوگ کثیر الجہتی غربت (Multi-dimensional Poverty) میں جی رہے ہیں۔ بے گھر افراد کی تعداد میں بے تحاشہ اضافہ ہو رہا ہے اور دی وال سٹریٹ جرنل کی رپورٹ کے مطابق گزشتہ 5 برسوں میں دنیا کے 32 بڑے شہروں میں گھروں کی قیمتوں میں 24 فیصد اضافہ دیکھا گیا ہے۔ امیر اور غریب کی تفریق میں واضح اضافہ ہو رہا ہے۔ آکسفیم کی ایک رپورٹ کے مطابق دنیا کے 26 امیر ترین افراد کی دولت دنیا کی آدھی آبادی کی دولت کے مساوی ہے۔ کل عالمی قرضہ تقریباً 184 کھرب ڈالر سے تجاوز کر چکا ہے جو عالمی جی ڈی پی کا 90 فیصد بنتا ہے اور سالانہ بنیادوں پر اس میں کئی گنا اضافہ دیکھا جا رہا ہے۔ 90 فیصد عالمی معیشت سست روی کا شکار ہے اور نمو (Growth) کی تمام تر پیشین گویاں دھڑام سے زمین بوس ہوتی جا رہی ہیں۔

اس عالمی معاشی زوال کے نتیجے میں پچھلے سال اور حالیہ سال کے اندر مختلف ملکوں میں لاکھوں کی تعداد میں عوام سڑکوں پر نکلی۔ صرف حالیہ ایک برس کے اندر ہمیں ترقی یافتہ فرانس سے لے کر پسماندہ ملک ہیٹی تک میں عوام سڑکوں پر نظر آئی۔ یہ لوگ روٹی، کپڑا، مکان، روزگار اور باعزت زندگی کیلئے احتجاج کر رہے تھے۔ سوڈان کے اندر دہائیوں سے حکمران سرکار کا تختہ اُلٹ کر رکھ دیا گیا تو ایکواڈور کے اندر پارلیمنٹ پر عوام نے قبضہ کر لیا۔ ہانگ کانگ کے اندر آدھی سے زیادہ آبادی نے چین کی گماشتہ حکومت کے جبر کے خلاف سڑکوں پر علمِ بغاوت بلند کیا۔ ہیٹی، چلی، لبنان، عراق اور ایران سمیت مشرق وسطیٰ کے دیگر کئی ممالک میں مہنگائی کے خلاف لاکھوں کی تعداد میں احتجاج کرنے والوں پر پولیس اور فوج کی جانب سے شدید جبر کیا گیا، لاٹھیاں چلائی گئیں، آنسو گیس شیلنگ کی گئی اور مہنگائی کے خلاف آواز بلند کرنے پر ہزاروں محنت کش نوجوانوں اور بزرگوں کو جیلوں میں ڈالا گیا۔ اسی طرح ماحولیاتی تبدیلیوں کے خلاف پوری دنیا میں احتجاج کیے جا رہے ہیں جن میں سکول کے بچوں کا قائدانہ کردار ہے۔ آج دنیا کا ہر کونا احتجاجوں کی لپیٹ میں ہے اور جہاں ابھی سطح کے اوپر اس وقت تک خاموشی نظر آ رہی ہے وہاں ہمیں سطح کے نیچے شدید بے چینی نظر آتی ہے جو مسلسل بڑھ رہی ہے اور کسی بھی وقت آتش فشاں سطح کو پھاڑ کے سب کچھ بھسم کرنے کو تیار ہے۔

امریکہ جو ماضی میں دوسری ریاستوں کی تقدیروں کے فیصلے کرتا آیا ہے آج خود شدید معاشی و سیاسی بحران کا شکار ہے۔ آئی ایم ایف اور ورلڈ بینک جیسے ادارے چلانے والی ریاست اس وقت 22 کھرب ڈالر کی مقروض ہے۔ آزاد منڈی (Free Market) کا نعرہ اپنے

اُلٹ میں بدل چکا ہے اور تجارتی جنگ (Trade War) کا آغاز ہو چکا ہے۔ حالیہ برسوں میں چین اور امریکہ کے درمیان اس تجارتی جنگ کی جھلکیاں واضح نظر آئیں۔

چین جو امریکہ کے بعد دوسری بڑی معیشت ہے آج وہ بھی شدید بحران کا شکار ہے۔ چین کی جی ڈی پی 2019 میں 6.1 فیصد رہی جو 2008 سے پہلے 14 فیصد ہوا کرتی تھی۔ چین کو ذائد پیداوار کے بحران (Crisis of Overproduction) کا سامنا ہے۔ بی آر آئی منصوبہ (سی پیک جس کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے) اسی بحران سے نکلنے کی ایک ''ناکام'' کوشش ہے۔ مہنگائی اور بے روزگاری میں بھی بہت بڑے پیمانے پر اضافہ ہوا ہے اور اسکے خلاف شدید عوامی غصہ پایا جا رہا ہے جس کا اظہار کئی احتجاجوں کی صورت میں ہو رہا ہے۔ دراصل میڈیا پر سخت سنسر شپ کی وجہ سے چین کی خبریں باہر نہیں آپاتیں اس لیے بظاہر یہ لگتا ہے کہ وہاں سب اچھا ہے، جبکہ حقیقت اس سے بالکل الٹ ہے۔

یورپی یونین کا آج شیرازہ بکھر رہا ہے۔ 2019 میں یورپی یونین کی معاشی شرحِ نمو 1.5 فیصد رہی جو 2018 میں 2.2 فیصد تھی۔ برطانیہ یورپی یونین سے علیحدہ ہو چکا ہے، فرانس میں پیلی واسکٹ تحریک اور پینشنوں کیلئے ہونے والے احتجاجوں میں لاکھوں لوگوں کو سڑکوں پر دیکھا گیا، یونان قرضوں میں ڈوبا ہوا ہے اور شدید ترین مہنگائی کی لپیٹ میں ہے، یورپ کا انجن کہلائے جانے والے جرمنی میں بھی معاشی

تنزلی آنا شروع ہوگئی ہے جسکی معیشت 2019 میں صرف آدھا فیصد ہی بڑھ پائی، اٹلی پر کل جی ڈی پی کے 132 فیصد قرضہ ہے۔

اسی طرح افریقہ کے کئی ممالک جیسے برکینا فاسو، برونڈی، کانگو، گیمبیا اور زمبابوے میں عوام نے تیس تیس سال سے اقتدار کو چپکی ہوئی قیادتوں کو بزورِ طاقت اکھاڑ پھینکا۔ طاقت کا سرچشمہ سمجھی جانے والی شخصیات عوام کے احتجاجوں کے آگے بے بس ثابت ہوئیں۔

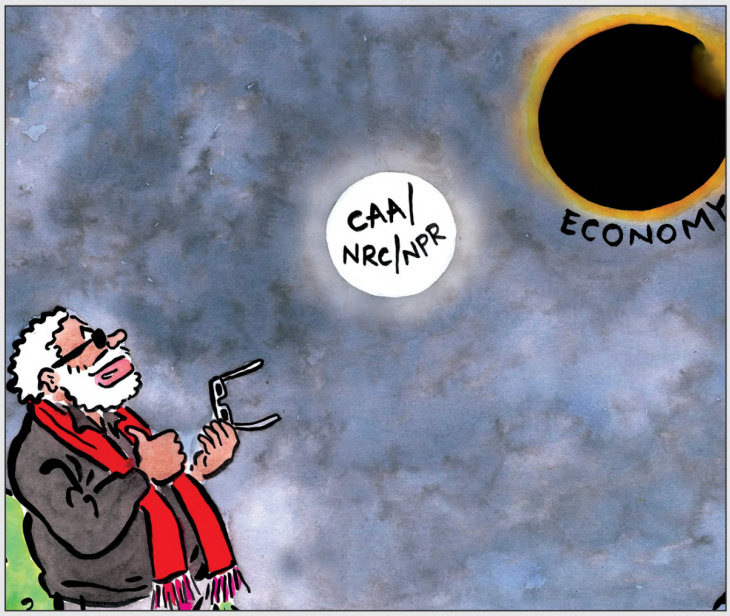

ہندوستان، جس کی معاشی ترقی کے ہر جگہ گن گائے جا رہے ہیں، درحقیقت شدید معاشی بحران کا شکار ہے۔ ہندوستان کی جی ڈی پی گزشتہ سال 6.8 فیصد کے مقابلے میں اس سال صرف 5 فیصد رہی، نیز حالیہ عرصے کے اندر ہندوستان کے 25 کروڑ محنت کشوں کی ملک گیر عام ہڑتال اور شہریت کے قانون کے خلاف تا حال جاری عوامی تحریک ہندوستان کے اندر بدلے ہوئے عہد کی عکاسی کر رہی ہے۔

ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ اس وقت موجودہ نظام مکمل طور پر تباہی کے دہانے پہ کھڑا ہے اور سوائے خرابیوں اور رسوائیوں کے اس کے پاس دینے کو کچھ نہیں۔ امیر اور غریب کی تفریق تاریخ کی بلند ترین سطح پر پہنچ چکی ہے۔ آج تمام تر انسانی ترقی مٹھی بھر افراد کے منافعوں کے نظر ہو رہی ہے اور اس سیارے کے وجود کیلئے خطرہ بن چکی ہے۔ پوری دنیا میں ابھرنے والی تحریکیں موجودہ نظام کی ناکامی کا اعلان ہیں اور ایک نئے عہد کا آغاز ہیں جہاں عوامی شعور معیاری طور پر ترقی کرتے ہوئے ان پرانے ڈھانچوں کو اکھاڑ پھینکنے کو تیار ہے۔ ان تمام عوامی بغاوتوں میں خصوصاً نوجوانوں کی بہت بڑی تعداد دیکھنے کو ملی ہے۔ بلکہ ان تمام تحریکوں کی قیادت ہی نوجوانوں نے کی ہے۔ یہ وہ نئی نسل ہے جو پرانے نظام کو ماننے سے انکار کر چکی ہے۔ سال 2020 میں ان عوامی بغاوتوں کی تعداد میں بھی اضافہ دیکھنے کو ملے گا اور انکی شدت میں بھی۔ مستقبل کی تحریکوں میں بھی نوجوانوں کا کلیدی کردار ہوگا۔

وہ وقت آن پہنچا ہے کہ اب تمام تر دولت کو مٹھی بھر افراد کے منافعوں کے شکنجوں سے آزاد کرا کر ایک ایسے سماج کی تشکیل کی جائے جہاں سماج کی ساری دولت پر چند لوگوں کا قبضہ نہ ہو، بلکہ وہ پورے سماج کی ملکیت ہو۔ جہاں انسان جینے کا سامان کرنے کیلئے جینے کی بجائے، جینے کی خاطر جینے کا سامان کرے۔

فلسفہ کیوں پڑھنا چاہیے؟

(تحریر: سلمہ ا)

اکثر یہ سوال سننے میں آتا ہے کہ فلسفہ کیوں پڑھنا چاہیے۔ فلسفہ پڑھ کر کیا حاصل ہو جانا ہے یا کون سا تیر مار لینا ہے۔ اول تو جس سماج میں ہم رہتے ہیں وہاں فلسفہ پڑھنے والے کو تمسخر کا نشانہ بنانا عام سی بات ہے، اسے خبطی سمجھا جاتا ہے۔ لیکن ہمارا موضوع یہ ہے کہ فلسفہ کیوں پڑھنا چاہیے، فلسفہ پڑھنے والے کو فلسفہ پڑھنے سے کیا حاصل ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ہم اس بات کا جائزہ بھی لیں گے کہ فلسفے کی جانب عوام کے منفی رویے کی کیا وجوہات ہیں اور ان وجوہات میں کس کا مفاد ہے۔ آج ہم جس سماج کا حصہ ہیں وہاں بچپن ہی سے انسان کی ریزن (reason) کو ختم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ ہر بات جو انسان بچپن میں اپنے ارد گرد کے لوگوں سے غیر رسمی تعلیم کے ذریعے سیکھے بغیر سوچے سمجھے عقیدے کی طرح ساری زندگی اس پر عمل کرتا رہے۔ ان سب کے بعد جب تعلیمی اداروں میں رسمی تعلیم کی باری آتی ہے تو وہاں اداروں کی انتظامیہ اور اساتذہ مل کر یہی کام بخوبی سر انجام دیتے نظر آتے ہیں۔ طلبہ کو ان کے تعلیمی مسائل پر سوال اٹھانے پر قدغنیں لگائی جاتی ہیں، فیسوں میں بڑھتے اضافے، ہراسمنٹ اور اپنے دیگر مسائل پر بات کرنے سے روکا جاتا ہے۔ طلبہ کی چیزوں کو پرکھنے اور ان پر سوچنے کی صلاحیت کو ختم کیا جاتا ہے۔ جو کچھ پڑھایا جا رہا ہوا سے طوطوں کی طرح رٹ کر میرٹ پر آئیں اور آگے چلتے بنیں، بس!

ہم اپنے اردگرد انسانوں کی اکثریت کو بے شمار مسائل سے دوچار دیکھتے ہیں۔ بے روزگاری، مہنگا علاج، مہنگی تعلیم، غربت، جنگ اور دوسرے مسائل جو دن بہ دن کم ہونے کی بجائے بڑھتے جا رہے ہیں۔ سرمایہ دارانہ نظام میں انسانوں کی اکثریت کو ان مسائل میں مسلسل پستا دیکھ کر ذہن میں سینکڑوں سوال اٹھتے ہیں کہ کیا یہ اکثریت ہمیشہ سے ان مسائل میں گھری زندگی گزار رہی ہے اور کیا یہ سب ہمیشہ یونہی چلتا رہے گا؟ ہم یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ کیوں امیر امیر تر اور غریب غریب تر ہوتا جا رہا ہے؟ حل ہے؟ اگر کوئی حل ہے تو کیا ہے؟ کس طرح بنی نوع انسان ان تکلیفوں سے چھٹکارا حاصل کر سکتا ہے؟

جب ہم ان مسائل کے حل کے لیے میڈیا کا رخ کرتے ہیں تو وہاں براجمان یہ بڑے بڑے ''دانشور'' اپنی دانشوری جھاڑتے نظر آتے ہیں۔ تعلیمی نصاب، جسے پڑھانے کا یہاں کاروبار کیا جا رہا ہے، کی طرف جائیں تو جگہ جگہ ہمیں صبر و شکر کرنے کا پاٹ پڑھایا جاتا ہے۔

انسانوں کے امیر اور غریب ہونے کو ان کا مقدر ٹھہرایا جاتا ہے۔

کیا آج انسان ویسی ہی زندگی گزار رہا ہے جیسی زندگی کی وہ خواہش کرتا ہے؟ کیا اس دنیا میں ایسا کوئی انسان ہے جو اس بات کی خواہش کرتا ہو کہ وہ بے روزگار ہو جائے؟ کیا ایسا کوئی انسان ہے جو اس بات سے مطمئن ہو کہ وہ اور اس کی اولاد قابل علاج بیماریوں کے ساتھ صرف اس وجہ سے مر جائیں کہ اس کے پاس علاج کے لیے پیسے نہ ہوں؟ ایسا کوئی انسان ہے جو چاہے کہ اس کے بچے تعلیم سے محروم رہ جائیں؟ کیا ایسا کوئی انسان ہے جو یہ چاہے کہ اس پر جنگیں مسلط کی جائیں؟ یقیناً ایسا کوئی انسان اس کرہ ارض پر وجود نہیں رکھتا۔ تو پھر کیوں آج انسان ان محرومیوں اور اذیتوں میں دھنستا چلا جا رہا ہے اور ان سب کا کوئی

کیا جو کچھ ہمیں پڑھایا جاتا ہے، دکھایا جاتا ہے، بتایا جاتا ہے، وہ سب سچ ہے؟ اگر وہ سب سچ نہیں ہے تو پھر سچ کیا ہے؟ سچ کو کیوں چھپایا جا رہا ہے؟ کون چھپا رہا ہے اور کیوں؟ ان سب باتوں کا جواب ہمیں فلسفہ دیتا ہے کہ کس طرح چیزوں کے ظاہر سے (جو دکھایا جا رہا ہے)، ان کے ماہیت (چیزیں اپنی اصل میں جو ہیں) کو پکڑا جائے۔ فلسفے کا کام سچائی کو قابل رسائی بنانا ہے تاکہ سچائی عوام سے ڈھکی چھپی نہ رہے۔

فلسفہ ہمیں چیزوں کو پرکھنے، دیکھنے، سوچنے اور جاننے کا ڈھنگ سکھاتا ہے۔ جب انسان فلسفے کو اپنا ساتھی بنا لیتا ہے تو وہ اپنے گرد ہونے والے واقعات کے بارے میں سوچنا، تنقید کرنا اور

سوال کرنا بھی سیکھ جاتا ہے۔ وہ جھوٹے اور گھسے پھٹے اعتقادات سے اپنا پیچھا چھڑا کر سچائی کے علم کا ہاتھ تھام لیتا ہے۔ انسان جان لیتا ہے کہ امیر یا غریب ہونا کوئی تقدیر نہیں بلکہ اس کی بنیادی وجہ سماج کی طبقاتی تقسیم ہے۔ وہ کسی ٹرک کی بتی کے پیچھے نہیں بھاگتا بلکہ وہ جاننے کی کوشش کرتا ہے کہ کون سی بتی اسے کس جانب لے جا رہی ہے یا لے کر جا سکتی ہے۔

فلسفہ طبقاتی مفادات کی عکاسی کرتا ہے۔ جیسا کہ ہم جانتے ہیں کہ ہم سرمایہ دارنہ نظام میں رہ رہے ہیں جو سماج کو دو طبقوں میں تقسیم کرتا ہے، مزدور طبقہ اور سرمایہ دار طبقہ۔ فلسفہ بتاتا ہے کہ کس طرح اس نظام میں ایک طبقے کا مفاد دوسرے طبقے کے نقصان کے ساتھ مشروط ہے۔ یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ کس طرح یہ نظام انسان کی زندگی کے ہر پہلو اور ہر شعبے کو اپنا غلام بنا کر رکھتا ہے۔ یہاں تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی طلبہ سرمایہ داروں کے سرمائے میں اضافہ کرنے کے لیے اپنی قوت محنت بیچتے ہیں۔ یہاں اگر مزدور بیمار ہو جائے تو وہ ڈاکٹر کے پاس اپنے لیے شاید اتنا نہیں جاتا جتنا وہ اس مقصد کے لیے جاتا ہے کہ اگر صحت یاب نہ ہوا تو مزدوری کرنے نہیں جا پائے گا اور اگر مزدوری کرنے نہیں جائے گا تو اس کا مالک اسے کام سے فارغ کر دے گا اور مزدور کے گھر کا چولہا ٹھنڈا پر جائے گا۔ فلسفہ اس نظام کا غلیظ چہرہ ہم پر آشکار کرتا ہے۔

یہاں کا حکمران طبقہ اپنے مفاد کے لیے عوام الناس میں عقل دشمن نظریات پھیلانے کی سر توڑ کوشش کرتا ہے اس کے لیے یہاں کا غلام میڈیا اور نام نہاد دانشور جو اپنے انفرادی مفاد کے لیے اجتماعیت کے مفادات کا سودا کرتے ہیں، جو اپنے قلم کا سودا کرتے ہیں، ہر وقت حکمران طبقے کے لیے حاضر رہتے ہیں۔ روسو اپنی کتاب ''اعترافات (Confessions)'' میں لکھتا ہے کہ ''ایک لالچی قلم سے عظیم تحریر کا لکھے جانا کبھی بھی ممکن نہیں۔'' ایک عظیم تحریر یقیناً وہی ہوگی جو انسان

دوست ہو اور انسان کے مسائل اور اس کے حقیقی اور مادی حل پر بات کرے۔ حکمران طبقہ رجعت پرست نظریات کے ذریعے غیر سائنسی تصور کائنات کی ترویج کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ عوام آنکھیں بند کر کے اس کے مطیع بن جائیں۔ عوام الناس کو بس نیک بن جانا چاہیے، اچھی اچھی 'پازیٹو' قسم کی باتیں کرنی چاہئیں۔ اگلے جہاں جا کر اعلیٰ وارفع زندگی کے مزے لوٹنے کے چکر میں اپنی حقیقی زندگی کے تمام مسائل کو بھلا کر صبر وشکر کی زندگی بسر کرے۔ جبکہ حکمران طبقہ اسی عوام کو مونڈھے اور اسی عوام کی محنت سے پیدا ہونے والی دولت پر عیاشیاں کرے۔ حکمرانوں کا پالتو "دانشور" طبقہ اس نظام کی شان میں قصیدے پڑھتا نہیں تھکتا اور موجودہ نظام کو ناقابل تغیر اور ابدی نظام قرار دیتا ہے۔

فلسفہ صرف اسی سوال کا جواب نہیں دیتا کہ دنیا کیا ہے۔ فلسفہ اس سوال کا جواب بھی دیتا ہے کہ دنیا کی جانب ہمیں کیا رویہ اختیار کرنا چاہیے اور کس طرح اس کی تعمیر نو کرنی چاہیے۔ مارکس کے الفاظ میں کہ "فلسفیوں نے دنیا کی مختلف طریقوں سے وضاحت کی ہے۔ لیکن اصل کام اسے تبدیل کرنا ہے۔" فلسفہ ہمارے مقصد اور اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ہماری راہ کا تعین کرتا ہے۔ آج مارکسسٹ۔ لیننسٹ (Marxist-Leninist) فلسفہ ہی اس دنیا کو تبدیل کرنے کے لیے بنی نوع انسان کی صحیح معنوں میں رہنمائی کرتا ہے۔ ایک ایسا فلسفہ جو اس بات کا دعویٰ کرتا ہے کہ انسان اس کائنات کے اسرار ورموز اور اس میں مسلسل ہونے والی تبدیلیوں کو جان سکتا ہے۔ آج انسان اپنی عقل اور محنت سے اس پوری کائنات کو اقلیت کے چنگل سے آزاد کروا کر اسے اکثریت کے لیے نچھاور کر سکتا ہے۔ وہ اکثریت جو اپنی قوت محنت سے پوری دنیا کا نظام چلاتی ہے، جس کی حرکت کے بغیر اس دنیا کا پہیہ جام ہو جاتا ہے۔ لیکن یہ نظام اور اس کے دلال حکمران انسانیت کو ہمیشہ کے لیے بے بسی اور رسوائی کے گھٹاٹوپ اندھیروں میں دھکیلنا چاہتے ہیں۔ لیکن سچائی کو جتنا دبایا جائے وہ اتنے ہی زور و شور سے اپنا اظہار کرنے کا راستہ بناتی ہے۔ آج یہ بات بالکل واضح ہے کہ موجودہ نظام اپنے دن پورے کر چکا ہے اور اب اس میں انسانوں کے مسائل حل کرنے کی بالکل بھی گنجائش باقی نہیں رہی۔ ایک سوشلسٹ نظام کے تحت ہی انسانوں کے دکھوں کا مداوا کیا جا سکتا ہے۔ پاکستان کا مزدور طبقہ اور طلبہ ہی مل کر اس نظام کو بدلنے کی طاقت رکھتے ہیں۔ مارکسسٹ کسی عقیدے کے بنا پر نہیں بلکہ موجودہ سرمایہ دارانہ نظام اور سوشلسٹ نظام دونوں کی سائنسی بنیادوں پر پڑتال کر کے ہی سوشلزم کے انسان دوست سماج ہونے اور سرمایہ دارانہ نظام کے انسان دشمن نظام ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر لینن نے ہمیں بتایا کہ "کمیونزم ان نتائج پر اندھا دھند عقیدہ نہیں ہے جو کتابوں سے اخذ کیے گئے ہوں بلکہ وہ خیالات ہیں جن تک آدمی، پڑھی ہوئی چیز کو اچھی طرح تول کر اور اس پر غور کر کے، نتائج کا ثبوتوں سے مقابلہ کر کے اور اپنے آپ کو مطمئن کر کے کہ نتائج بلاشبہ ثابت ہو چکے ہیں، پہنچتا ہے۔" مارکسزم کا فلسفہ حکمران طبقے کے خلاف جدوجہد میں طلبہ اور مزدور طبقے کا نظریاتی ہتھیار ہے۔ جھوٹ، جسے رجعت پرست طبقات پھیلاتے ہیں، عوام الناس کو مجہول اور مطیع غلام بناتا ہے۔ اس لیے جھوٹ کے خلاف سچائی کے لیے، عقیدے کے خلاف علم کے لیے، مارکس ازم طبقاتی جدوجہد کا نظریاتی ہتھیار ہے۔

نوجوان قیادت اور طلبہ یونین کا تعلق

(تحریر: عمر ریاض)

پاکستان دنیا کے ان ممالک میں سے ہے جس کی آبادی کی اکثریت نوجوانوں پر مشتمل ہے جو کہ لگ بھگ آبادی کا 60 فیصد بنتی ہے۔لیکن آبادی کی اس اکثریت میں سے محض 4 فیصد سے بھی کم نوجوان اعلیٰ تعلیم حاصل کر رہے ہیں، جس کا دوسرا مطلب یہ ہے کہ صرف اس چھوٹی سی پرت کو ہی یہ آسائش حاصل ہے کہ وہ تعلیم و تربیت سے ہٹ کر سماجی، معاشی، معاشرتی، قانونی اور دیگر معاملات پر غور وفکر کر سکے، کیونکہ تعلیمی

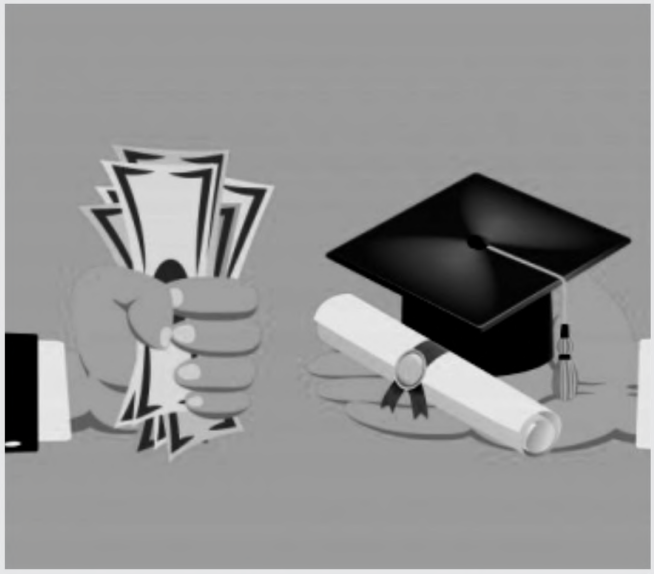

عمل میں ہونے کی وجہ سے یہ سماج کی نسبتاً سب سے شعور یافتہ پرت کہلاتی ہے اور باقی ماندہ 56 فیصد، جو اس نظام تعلیم کو خریدنے کی سکت نہیں رکھتے، میٹرک یا ایف اے، ایف ایس سی کے بعد اپنی اور اپنے خاندان کی زندگی کی ڈور کو چلائے رکھنے کیلئے روزی روٹی کے عمل میں پسنا شروع ہو جاتے ہیں جس وجہ سے وہ فوری ضروریات اور مسائل میں الجھ کر سماجی معاملات پر سوچ بچار کے مادی حالات ہی حاصل نہیں کر پاتے۔لیکن اگر پاکستان میں معیار تعلیم اور تعلیمی اداروں کی حالتِ زار کو مدنظر رکھا جائے تو ہمیں نظر آتا ہے کہ تعلیمی اداروں میں طلبہ کی ذہنی نشوونما اور بحث ومباحثے کے جمہوری ادارے پر پابندی اور تعلیمی نصاب کی ناگفتہ بہ حالت کی وجہ سے سماج کی یہ قلیل پرت بھی شعور کی منزلوں سے کوسوں دور محض تعلیمی اخراجات کی رسیدیں یعنی ڈگریاں اکٹھی کرنے اور نمبروں کی دوڑ میں لگی ہے اور ان کے نزدیک بھی تعلیم کا مقصد شعور حاصل کرنے کے برعکس نوکری اور بہتر مستقبل بنانے کا ایک ذریعہ ہے۔ اگر دیکھا جائے تو یہ طلبہ یونین اور طلبہ سیاست پر کئی

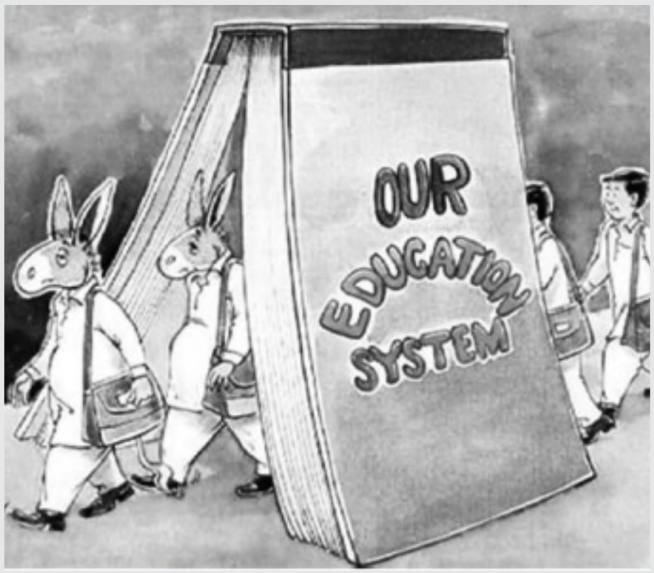

دہائیوں سے عائد پابندی کا ناگزیر نتیجہ ہے۔ ظاہر ہے جب آپ طلبہ کے جمہوری اتحاد پر ہی پابندی عائد کر دیں گے اور تعلیمی نصاب کو ایسی شکل میں ترتیب دیں گے جو آپ کو لکیر کا فقیر ہی بنا سکے تو ایسے ماحول میں تنقیدی اور تعمیری سوچ رکھنے والی نسل پروان نہیں چڑھ سکتی، بلکہ سماجی مسائل سے نابلد ایک کند ذہن نسل ہی پروان چڑھے گی۔ درحقیقت، اس کی ہی ضرورت تھی تاکہ سماج پر حکمرانی کے حق کو چند ہاتھوں میں محفوظ رکھا جا سکے اور اکثریتی آبادی کو ذہنی غلامی کے ساتھ ساتھ، معاشی سیاسی، ثقافتی اور فکری غلام بنایا جا سکے۔

جس طرح ایک نوجوان کی سماجی تربیت کی درسگاہ اس کے سماجی ادارے (خاندان، سکول، ماحول اور دیگر) کرتے ہیں اور ان کے بغیر انسان کی سماجی تربیت ممکن نہیں ہے، ایسے ہی ایک نوجوان کی سیاسی تربیت کیلئے بھی ادارے درکار ہوتے ہیں جن میں سب سے بنیادی ادارہ طلبہ یونین کا تھا، جو طلبہ کو نصابی سرگرمیوں کے ساتھ ساتھ، فلسفے، ادب، معیشت، ثقافت اور سیاست سے بھی روشناس کرواتا تھا۔ مل بیٹھ کر بحث ومباحثوں اور اپنے حقوق کے حصول کی جہدوجہد کا عمل طلبہ میں اجتماعیت کی اساس کو بیدار کرتا تھا۔ کمرہ جماعت سے لے کر کسی

بھی عوامی سرگرمی میں سوال کرنے کا آزادانہ حق استعمال کرنے سے تعمیری سوچ پروان چڑھتی تھی اور یہ سب چند لوگوں کی حکمرانی کے ازلی و ابدی حق کیلئے بہت خطرناک تھا۔ اس لیے ضیاء الحق کی آمریت میں اس ادارے پر پابندی عائد کرتے ہوئے طلبہ سے یہ حق ہی چھین لیا کہ وہ فلسفے، سائنس، ادب، سیاست جیسے ''بے کار'' علوم پر بات کریں۔ ہاں، اگر انہوں نے پڑھنا ہے تو سیاسیات، معاشیات، سائنس اور فلسفے کو بطور مضمون پڑھیں اور باقی عملی طور پر سیاست، معیشت اور دیگر سماجی معاملات پر بات کرنے کا حق بھی صرف چند لوگوں تک ہی رہنے دیں جن کو ''پیدائشی طور پر اس کے استعمال کا حق ہے''۔ جنہوں نے اس حق کو چھینا وہ اس سماج کی ساری دولت پر قابض ایک فیصدی حکمران طبقہ ہیں اور جن سے چھینا گیا وہ ساری دولت پیدا کرنے والے 99 فیصد محنت کش ہیں۔ اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ چونکہ طلبہ کو سیاست سے دور کر دیا گیا لہٰذا مزاحمت باقی نہیں رہی تو اب فیسوں میں لامتناہی اضافہ کرو، نصاب کو تبدیل کر دو، تعلیمی اداروں کو جیل خانے بنا دو، وہاں اپنی سرپرستی میں غنڈہ گرد جماعتیں بٹھا دو (تاکہ اگر کوئی آواز اٹھانا بھی چاہے تو اس کو سبق سکھا دیا جائے)، روزگار ختم کر دو اور بس انٹرن شپس کے نام پر مفت کی محنت حاصل کرو، ٹیکس بڑھاؤ، قرضے لو، کیونکہ اب تو پوچھنے والا کوئی ہے نہیں۔ آج چار دہائیوں کے خاتمے کے قریب ہو چکے ہیں اور ہمارے حالات زندگی بد سے بدتر ہو چکے ہیں۔ اب تو اس ابتری میں مزید شدت آتی جا رہی ہے۔ سماج کی اکثریت سماجی دباؤ کے نتیجے میں شدید ذہنی تناؤ کا شکار ہے۔ ان پڑھ تو ان پڑھ، پڑھے لکھے نوجوان نوکریوں کی تلاش میں مارے مارے پھر رہے ہیں اور روزگار کے حصول میں ناکامی ان کو نشے اور جرائم کی طرف دھکیل رہی ہے۔ صرف پچھلے ایک سال میں 31 فیصد لوگ بے روزگار ہو چکے ہیں۔ تعلیمی اداروں میں فیسوں کا بوجھ اتنا بڑھا دیا گیا ہے کہ سماج کی ایک بڑی اکثریت اب تعلیم کا خواب بھی نہیں دیکھ سکتی۔ خودکشیاں ہیں کہ بڑھتی ہی جا رہی ہیں۔ مہنگائی آسمانوں کو چھو رہی ہے اور لوگ مسلسل خط غربت سے نیچے گرتے جا رہے ہیں۔ ہسپتال ہیں کہ موت پیدا کرنے والے کارخانے بن چکے ہیں۔ انفراسٹرکچر کی خستہ حالی کا یہ عالم کہ آئے روز لوگ حادثات کا شکار ہو رہے ہیں اور سونے پر سہاگا کہ ایسے میں اگر کوئی بندہ آواز بلند کرنے کی کوشش کرتا ہے تو یونیورسٹی انتظامیہ سے لے کر تمام ریاستی ادارے مختلف قسم کے ''آئینی فتوے''

لے کر پہنچ جاتے ہیں اور زبردستی خاموش کرا دیا جاتا ہے تا کہ ''لا اینڈ آرڈر'' برقرار رہے۔ یعنی لوگوں کی ہڈیوں کا عرق مزید نچوڑا جا سکے اور حکمران طبقے کی عیاشیوں اور حکمرانی کو جاری رکھا جا سکے۔ لیکن آج نا صرف پاکستان بلکہ پوری دنیا میں حالات تیزی سے تبدیل ہو رہے ہیں۔ آج ہر شے اپنے الٹ میں تبدیل ہو رہی ہے۔ ہندوستان سے لے کر ہانگ کانگ اور ایران سے لے کر چلی تک ہر جگہ محنت کش اور طلبہ سڑکوں پر نکلے ہوئے ہیں اور اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ پاکستان میں بھی پرانا معمول ٹوٹ رہا ہے۔ طلبہ یونین کی بات تیزی سے پھیلنا شروع ہو رہی ہے، مزدور اتحاد قائم ہو رہا ہے، روزگار کی طلب میں شدت آ رہی ہے اور پورا سماج کروٹ بدلتے ہوئے سوال کرنے اور لڑنے کا آغاز کر رہا ہے۔

اس ساری صورتحال کے اندر طلبہ یونین کی بحالی ایک فیصلہ کن کردار ادا کرے گی اور پاکستانی سماج میں نوجوانوں کی نئی قیادت کے تخلیق ہونے کے حالات مہیا کرے گی۔ بیشک طلبہ کی قیادت ہوا میں تخلیق نہیں ہوگی اور نہ ہی محض طلبہ یونین کی بحالی کے اعلان سے خود رو انداز میں نمودار ہو جائے گی بلکہ لازمی طور پر یہ طلبہ کے سلگتے ہوئے مسائل، فیسوں میں اضافے، ہاسٹل کے فقدان، ہراسانی کے واقعات، ٹرانسپورٹ کے مسائل اور خاص طور پر بیروزگاری جیسے بنیادی مسائل کے حل کے خلاف جدوجہد میں ہی تخلیق ہوگی جس میں طلبہ یونین اہم کردار ادا کر سکتی ہیں، جہاں وہ آزادانہ طور پر اپنے مسائل کے حل کیلئے اجتماعی طور پر جدوجہد کا آغاز کریں گے۔ ''اجتماعی بنیادوں پر لڑنے کا احساس'' ان کو تعلیمی اداروں سے باہر کے گہرے ہوتے ہوئے سماجی مسائل کی طرف دیکھنے پر مجبور کرے گا۔ باہر انہیں کروڑوں محنت کشوں (مزدوروں اور کسانوں) کی جدوجہد نظر آئے گی۔ اگر اس لڑائی کو آپس میں شعوری طور پر جوڑ دیا جائے تو نا صرف حکمران طبقے کے حملوں کا بخوبی مقابلہ کیا جا سکے گا بلکہ غربت، جہالت، لاعلاجی، بھوک، مفلسی، بیروزگاری اور جبر کی ہر شکل کی بنیاد اس منافع پر مبنی سرمایہ دارانہ نظام کا خاتمہ کیا جا سکتا ہے۔

پاکستان:
طبقاتی نظام تعلیم اور نوجوانوں کا مستقبل

(تحریر: خالد مندوخیل)

''علم بڑی دولت ہے'' یہ وہ جملہ ہے جو پاکستان میں پرائیویٹ تعلیمی اداروں کی چار دیواریوں پر دیگر کئی اشتہارات (پوزیشن لینے والے طالب علموں کی تصاویر بمع نمبر) کیساتھ اکثر لکھا ہوا نظر آتا ہے۔ان پرائیویٹ تعلیمی اداروں کے مالکان کیلئے اس جملے کا مطلب ''دھن دولت'' ہے۔گلی محلے میں کھلے ہوئے پرائیویٹ سکولوں، وزیروں، مشیروں اور ریٹائرڈ فوجی افسران کی بڑے شہروں میں بنائی گئی یونیورسٹیوں، کالجوں اور اکیڈمیوں کی صورت میں ''تعلیم'' کا یہ دھندا واضح طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ان سب کیلئے واقعی علم بہت بڑی ''دولت'' ہی تو ہے۔تعلیمی نظام کا سرسری سا جائزہ لینے کے بعد آسانی سے کہا جا سکتا ہے کہ تعلیم ایک منافع بخش کاروبار ہے جس میں ''علم'' کو منڈی کی ایک شے کے طور پر بیچا جاتا ہے۔

اسی لیے تو تعلیم کا بجٹ جی ڈی پی کے 2 فیصد سے بھی کم ہے، جو کہ پورے جنوبی ایشیا میں کم ترین ہے۔اب ظاہر ہے جب ''پالیسیاں بنانے والوں اور انکے یاروں دوستوں'' کا اپنا دھندہ ہی تعلیم پر چلتا ہو تو کیونکر تعلیم کے بجٹ کو بڑھایا جائے!

پاکستان دنیا کی چند کثیر آبادی رکھنے والے ممالک میں شمار ہوتا ہے جس کی 21 کروڑ کے قریب آبادی میں سے 65 فیصد یعنی تیرہ کروڑ کے لگ بھگ تیس سال سے کم عمر کے نوجوانوں پر مشتمل ہے۔سکول سے باہر بچوں کی تعداد کے لحاظ سے پاکستان دنیا میں دوسرے نمبر پر ہے۔یہ تعداد اڑھائی کروڑ سے اوپر ہے۔اس بات کا اعتراف نام نہاد تبدیلی سرکار نے برسر اقتدار آتے ہوئے بھی کیا تھا۔صنفی تفریق کے لحاظ سے یہ ملک دنیا کے چند پسماندہ ترین ممالک میں شمار ہوتا ہے۔حکومتی ذرائع کے مطابق شرح خواندگی 58 سے 59 فیصد ہے لیکن حقیقت میں یہ اس سے بھی کم ہے۔ساڑھے تیرہ کروڑ نوجوانوں اور بچوں کیلئے تین لاکھ سے بھی کم ادارے ہیں جن میں بھی آدھے سے زیادہ پرائیویٹ ادارے ہیں۔ملک بھر میں اس وقت زیر تعلیم طلبہ کی کل تعداد 5 کروڑ سے بھی کم ہے جسکا مطلب ہے کہ نوجوانوں اور بچوں کی باقی 8 کروڑ میں اکثریت تعلیم سے محروم ہے جو پھر چائلڈ لیبر، جرائم، منشیات اور دہشت گردی یا ذہنی بیماریوں کا شکار ہے۔اس طرح یہ ایک طویل فہرست ہے لیکن ان حقائق کا اہم پہلو یہ ہے کہ حکمران طبقے کے شہزادے اور شہزادیاں ان میں شامل نہیں ہیں انکے لیے اسی ملک میں ایک الگ نظام تعلیم موجود ہے (اکثریت بہرحال بیرون ملک ہی جانا پسند کرتے ہیں)۔اس ملک کے ''معزز حکمرانوں'' (سرمایہ دار، جاگیردار، بیوروکریٹ، جرنیل اور جج وغیرہ) کے بچے اس ملک کے غریبوں سے لوٹے گئے وسائل پر بیکن ہاوس، کیمبرج سکولنگ سسٹم، لاہور امریکن سکول جیسے فائیو سٹار ہوٹل نما پرائیویٹ تعلیمی اداروں میں ابتدائی تعلیم حاصل کرتے ہیں اور پھر اعلیٰ تعلیم کیلئے بیرون ملک نکل جاتے ہیں۔ان میں سے کئی تو بیرون ملک ہی سیٹل ہو جاتے ہیں اور جو واپس پاکستان آتے ہیں وہ یہاں آ کر یا تو خاندانی کاروبار سنبھال لیتے ہیں یا پھر سیاست میں آ کر یہاں کے محنت کشوں پر حکمرانی کرتے ہیں۔

دوسری طرف غریبوں کے بچے بھیڑ بکریوں کی طرح کلاسوں میں ٹوٹی ہوئی کرسیوں اور ٹاٹ پر بیٹھ کر جیل نما سرکاری سکولوں میں ایک غیر معیاری اور پسماندہ نصاب پڑھنے پر مجبور ہیں۔پاکستان میں سکول سے لے کر یونیورسٹی تک دو الگ نصاب پڑھائے جاتے ہیں۔

دوسری طرف غریبوں کے بچے بھیڑ بکریوں کی طرح کلاسوں میں ٹوٹی ہوئی کرسیوں اور ٹاٹ پر بیٹھ کر جیل نما سرکاری سکولوں میں ایک غیر معیاری اور پسماندہ نصاب پڑھنے پر مجبور ہیں۔ پاکستان میں سکول سے لے کر یونیورسٹی تک دو الگ نصاب پڑھائے جاتے ہیں۔ امیروں کے بچوں کیلئے مغربی طرز پر ''کیمبرج سکولنگ سسٹم'' جیسا جدید نصاب (وہ الگ بات ہے کہ سکھائی اس میں بھی انسان دشمنی ہی جاتی ہے بہر حال دور جدید سے آشنا ضرور کرایا جاتا ہے تا کہ کل کو ان حکمرانوں کے بچے حکمرانی کرنے کیلئے تیار ہو سکیں) جبکہ غریبوں کیلئے پسماندہ میٹرک سسٹم جس میں باوا آدم کے زمانے کی باتیں ہوتی ہیں اور ان باتوں کو ڈنڈے کے زور پر طلبہ کو حفظ کروایا جاتا ہے۔ اس طرح طلبہ کی تخلیقی صلاحیتوں کو مفلوج کرتے ہوئے انہیں سر جھکا کر تابعداری کرنے کا درس دیا جاتا ہے، جسکا مقصد مستقبل میں نوجوانوں سے سیاسی و معاشی حقوق کے لئے سوچنے اور جدوجہد کرنے کی صلاحیت کو چھین لینا ہوتا ہے۔

بالفرض ان میں سے کوئی قرضے لے کر کسی طرح اعلیٰ تعلیم تک پہنچ بھی جائے تو وہ فیصلہ کرنے کی اہلیت ہی کھو بیٹھا ہوتا ہے۔ میڈیکل، انجینئرنگ، وکالت، ایم۔بی۔اے وغیرہ جیسی بھول بھلیوں میں سے کوئی راستہ منتخب نہ کر سکنے کی ہیجانی کیفیت سے گزرنے کے بعد بہت کم تعداد دھکے کھا کر، کالج و یونیورسٹی انتظامیہ کی فرمانبرداری کر کے اور اپنی اوقات سے بڑھ کر فیسیں ادا کرنے کے بعد جب ڈگری ہاتھ میں لے کر محنت کی منڈی میں قدم رکھتے ہیں تو یونیورسٹی میں انہیں دکھائے گئے سبز باغ کے برعکس تلخ حقیقت کا سامنا ہوتا ہے۔ محنت کی اس منڈی میں انکے لیے کوئی جگہ نہیں ہوتی۔ اگر کوئی نوکری ملتی بھی ہے تو سیکورٹی گارڈ، چپڑاسی یا ویٹر وغیرہ کی۔ ایسے میں اکثریت جرائم کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کچھ انہیں نوکریوں پر گزارا کرتے ہوئے زندگی کا پہیا چلانا شروع کر دیتے ہیں اور کچھ نوکریوں (انکی ڈگریوں کے مطابق) کی تلاش میں ادھر ادھر کے دھکے کھاتے رہتے ہیں۔

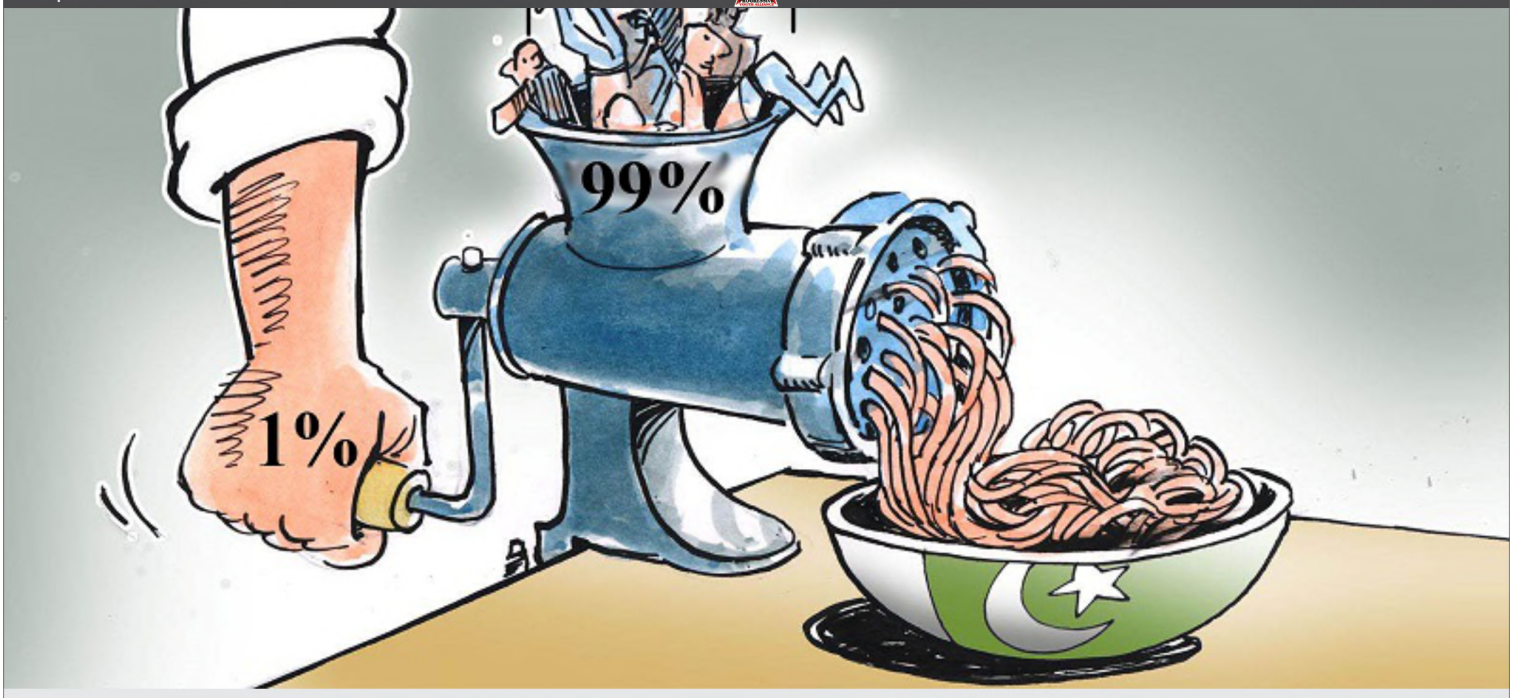

یہ سماج ''دونہیں ایک پاکستان'' کے فراڈ پر مبنی نعرے کے برعکس ''ایک نہیں دو پاکستان'' کی منظر کشی کرتا ہے۔جس میں ایک پاکستان امیروں کا ہے اور دوسرا پاکستان غریبوں کا۔ایک پاکستان جرنیلوں، سیاست دانوں، بیوروکریٹوں، ججوں، سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کا ہے اور دوسرا مزدوروں، کسانوں اور مظلوموں کا ہے۔اس لیے پاکستان میں موجود اس ''طبقاتی تعلیمی نظام'' کا خاتمہ اس طبقاتی سماج کے خاتمے کیساتھ ہی کیا جاسکتا ہے۔

دوستو! اب صرف چہرے ہی نہیں بلکہ نظام کو بدلنے کا وقت آ گیا ہے۔ یہ سرمایہ دارانہ نظام آج پوری دنیا میں گل سڑ رہا ہے اور اس کے خلاف پوری دنیا میں مزدور، کسان اور طلبہ بغاوت کر بیٹھے ہیں۔ہمیں بھی پاکستان میں اسکے خلاف منظّم ہو کر جدوجہد شروع کرنی ہو گی۔ اس جدوجہد کی بنیاد سوشلزم کے انقلابی نظریات ہونے چاہئیں۔

آیئے، سوشلزم کی صورت میں ایک ایسے سماج کیلیئے لڑیں جس میں طبقاتی نظام تعلیم نہ ہو۔ایک ایسا سماج جس میں دولت چند ہاتھوں میں مقید نہ ہو بلکہ پورے سماج کی ملکیت ہو۔ایسا سماج جس میں ہماری تقدیروں کے فیصلے ان ایوانوں میں بیٹھے مٹھی بھر سرمایہ دار اور جاگیردار نہ کریں بلکہ اپنی تقدیروں کے فیصلے ہم خود کریں۔ یہ ہو گا حقیقی انقلاب!

انقلاب کے تین نشان

طلبہ، مزدور اور کسان!

ناسور

(افسانه)

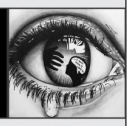

(تحریر: نفیسہ)

گرمی اپنے پورے جوبن پر تھی، وہ سڑک کنارے کھڑی رکشے کا انتظار کر رہی تھی۔ایک غریب خاندان سے تعلق رکھنے والی، عام سے نین نقوش رکھنے والی عام سی لڑکی۔اس کے محنت کش باپ نے دن رات محنت کر کے اس کو پرائیویٹ ایم اے کروایا تھا۔پچھلے دو سال سے وہ نوکری کے لئے خوار ہو رہی تھی، آج بھی ایک پرائیویٹ سکول میں انٹرویو دے کر آئی تھی۔وہ گھر داخل ہوئی تو سامنے ہی چھوٹی بہن منہ بنائے بیٹھی نظر آئی۔اس پہ نظر پڑتے ہی وہ بھاگ کر آئی۔''آپی مجھے نیا یونیفارم لینا ہے اور دیکھو نا اماں مجھے منع کر رہی ہے'' منہ بسورتے ہوئے مومنہ نے شکایت کی۔''ارے میں لے دوں گی نا اپنی بہن کو، چلو ابھی جا کے تم پڑھو''، اس نے اپنی چھوٹی بہن کو ٹالنے کی کوشش کی۔ ماں کے استفسار پر اس نے انٹرویو کا مختصر سا احوال سنا کر کہا کہ کچھ دن میں پتہ چلے گا کہ نوکری ملتی ہے یا یہاں سے بھی انکار ہو گا۔"چلو کچھ بہتر ہی ہو گا، تم کھانا کھا لو پھر بچے پڑھنے آ جائیں گے''، اس نے سر ہلایا اور کچن کی طرف چل دی۔شام کے چار بج چکے تھے مگر مانو آج بھی پڑھنے نہیں آئی تھی، حالانکہ روزانہ وہ پورے تین بجے رانیہ کے گھر ہوتی تھی۔علی اپنا کام تقریباً ختم کر چکا تھا۔رانیہ نے اس سے مانو کا پوچھا تو اس نے لاعلمی کا اظہار کیا۔مانو اور علی اس کے گھر سے پچھلی گلی میں رہتے تھے۔مانو 10 سال کی جبکہ علی 9 سال کا تھا۔نوکری نہ ملنے کی وجہ سے وہ ٹیوشن پڑھانے پر مجبور تھی، بڑھتی ہوئی مہنگائی نے مڈل کلاس طبقے تک کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا، غریب بیچارہ تو فاقوں تک کے حالات میں تھا۔خیر اس نے سوچا کہ کل مانو کے گھر جا کے پتہ کر لے گی۔اگلی صبح ہی اسے سکول سے لیٹر آ گیا، وہ خاصی حیرت میں تھی اور بہت خوش بھی۔اگلے دن وہ سکول کے وقت سے گھنٹہ پہلے وہاں پہنچ چکی تھی۔پرنسپل کے آفس میں انتظار کے لئے بٹھایا گیا۔آج اس کے چہرے کا رنگ ہی کچھ اور تھا جیسے اسکے ہاتھ قارون کا خزانہ لگ گیا ہو۔پرنسپل کے آتے ہی وہ کھڑی ہو گئی، وہ 50 سال کا چمکتی آنکھوں والا مرد تھا، چہرے پہ لاپرواہی کے تاثرات لئے وہ اسکو دیکھ رہا تھا۔رانیہ نے اپنا تعارف کروایا، سر ہلا کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا گیا۔''دیکھئے مس رانیہ ہم نے آپکو اس امید پہ نوکری دی ہے کہ آپ ہمارے سکول کی ریپوٹیشن پہ کوئی آنچ نہیں آنے دیں گی، آپ کل سے جوائن کر لیں اور اگر کوئی سوال ہے تو پوچھیں'' آدمی نے ایک ہی سانس میں بات ختم کی۔''سر میں سب باتوں کا خیال رکھوں گی مگر میرے گھر کے حالات ایسے ہیں کہ 6000 کی تنخواہ بہت کم ہے''، پرنسپل نے عجیب سی مسکراہٹ سے اسے دیکھا''آپ فکر نہ کریں، ہمارے مطابق کام کریں، آپ جو کہیں گی آپکو مل جائے گا''، اسکی آنکھوں میں کچھ عجیب سا تاثر تھا جسے دیکھ کر اس نے گھبرا کر نظریں نیچی کر لیں اور اجازت مانگ کر باہر نکل آئی یہ جانے بغیر کہ دو مسکراتی آنکھوں نے اسکا باہر تک پیچھا کیا تھا۔ مانو والے حادثے کو گزرے دو مہینے ہو چکے تھے اور ابھی تک قاتل کا کوئی سراغ نہیں ملا تھا ہاں مگر اس نوعیت کے دو مزید حادثے اسی علاقے میں پیش آ چکے تھے جسکی وجہ سے لوگوں میں خوف پھیل چکا تھا اور بچیوں کو اکیلے گھروں سے نکلنے نہ دیا جاتا تھا۔ایسے میں رانیہ کو علی کے رویے میں کچھ تبدیلی محسوس ہو رہی تھی۔وہ کافی دن سے کھویا اور ڈرا ہوا رہتا تھا، کچھ بولتا بھی نہیں تھا۔

رانیہ نے آخر اسکو پاس بٹھایا اور پوچھ لیا کہ کیا مسئلہ ہے۔ وہ کافی دیر چپ بیٹھا رہا پھر دبی سی آواز میں بولا ''مس مجھے قاری صاحب کے پاس پڑھنے نہیں جانا، آپ مجھے گھر میں پڑھا دیا کریں، میری اماں سے کہیں مجھے وہاں نہ بھیجے'' یہ کہہ کر وہ رونے لگا۔ رانیہ کو کسی انہونی کا اندیشہ ہوا۔ ''کیا مسئلہ ہے علی؟ وہ تمہیں مارتے ہیں کیا؟'' رانیہ نے پوچھا۔ ''ہاں۔۔اور۔۔'' علی خاموش ہو گیا۔ ''بولو، تمہیں ڈرنے کی ضرورت نہیں'' رانیہ نے اسے حوصلہ دیا، جو مانو کے ساتھ ہو چکا تھا وہ اب علی کے ساتھ نہیں ہونے دینا چاہتی تھی۔ ''مجھے بہت مارتے ہیں، گالیاں دیتے ہیں اور میری مرضی کے بغیر مجھے ہاتھ لگاتے ہیں''۔

رانیہ سکتے میں آ گئی۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ علی کو تو وہ بچا لے گی مگر ان باقی بچوں کا کیا ہوگا جو کسی کو بتا نہیں سکتے۔ اسے ان بچوں سے زیادہ خود پہ ترس آیا۔ وہ بھی تو دو مہینے سے پرنسپل کی معنی خیز باتوں اور نظروں کا سامنا کر رہی تھی اور آج تک کسی کو بتانے کی ہمت نہیں کر پائی تھی اور بتاتی بھی کیسے، اسکے کردار پہ اگر کوئی بات کرتا تو وہ برداشت نہ کر پاتی۔ وہ عجیب مخمصے کا شکار تھی۔ نہ جانے کتنے بچے ہوں گے جو اس طرح کی زیادتیوں کا شکار ہوں گے۔ نہ جانے کتنی لڑکیاں ہوں گی جو ہراسگی کا شکار ہوں گی اور صرف اس لئے خاموش ہوں گی کہ انکے خاندان کی عزت پہ کوئی آنچ نہ آئے، معاشرہ ان پہ انگلی نہ اٹھائے۔

ایسے بے شمار قصے ہیں جن کو گھروں کے اندر ہی دفن کر دیا جاتا ہے اور جو چند قصے باہر نکلتے ہیں انہیں انصاف کے انتظار میں زنگ لگ جاتا ہے۔اس سماج کی جڑیں نہ جانے کتنے معصوموں کی آہوں اور لہو سے کھوکھلی ہو چکی ہیں۔

اب انتظار اس بات کا ھے کہ کب شعور منظم ھو کر اس سماج کو اس کے ناسور سمیت نکال کر باھر کرتا ھے تا کہ آدمی انسان بن کر جی سکے !

فلم رکا ویو (Film Review)

دی لیجنڈ آف بھگت سنگھ

از: آدم پال

بھگت سنگھ اس خطے کی تاریخ کی ایک اہم ترین شخصیت ہے جس نے برطانوی سامراج کیخلاف آزادی اور سوشلسٹ انقلاب کی جدوجہد کرتے ہوئے 23 سال کی عمر میں جام شہادت نوش کیا۔ غاصب برطانوی حکمرانوں کی جانب سے اس عظیم انقلابی کو 23 مارچ 1931ء کو لاہور میں دو ساتھیوں سمیت پھانسی دے دی گئی تاکہ آزادی اور انقلاب کی اس جدوجہد کو کچل دیا جائے۔ لیکن اس ظلم کے باوجود یہ جدوجہد جاری رہی اور برطانوی سامراج کو یہ خطہ چھوڑ کے جانا پڑا۔ لیکن یہ بھگت سنگھ کے خواب کی تکمیل ابھی بھی نامکمل ہے جو ایک ایسی آزادی کا خواب دیکھتا تھا جس میں امیر اور غریب کی طبقاتی تفریق پر مبنی سرمایہ دارانہ نظام کا خاتمہ ہو اور ایک سوشلسٹ نظام کے تحت ہر قسم کے ظلم اور ناانصافی کا خاتمہ ہو سکے۔ بھگت سنگھ کی شخصیت اور جدوجہد آج بھی ہر جگہ انقلابی نوجوانوں کو نیا عزم اور حوصلہ عطا کرتی ہے اور اس کی لازوال قربانی نے نہ صرف اسے تاریخ میں ہمیشہ کے لیے زندہ کر دیا بلکہ وہ آج بھی انقلابی نوجوانوں کے دلوں کی دھڑکن ہے۔

یہی وجہ ہے کہ بھگت سنگھ پر بہت سی فلمیں بھی بنائی گئی ہیں اور مختلف کہانیوں اور تصانیف میں اس کا ذکر مسلسل کیا جاتا رہا ہے۔لیکن تاریخی کرداروں کے ساتھ ایک المیہ یہ بھی رہتا ہے کہ اس کا ذکر کرنے والے یا اس پر لکھنے اور فلمیں بنانے والے اپنے نظریات اس تاریخی شخصیت پر مسلط کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس تاریخی شخصیت کے نام اور جدوجہد کو اپنے موجودہ مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔یہی کچھ بھگت سنگھ کے ساتھ بھی کیا گیا ہے اور بھارت کی مختلف سرکاروں نے اسے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا ہے۔اس کے علاوہ مختلف مذاہب اور نظریات کے ماننے والوں نے اس کی شخصیت کو استعمال کیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ بھگت سنگھ پر بنائی جانے والی مختلف فلموں میں جہاں تھوڑے بہت حقائق کو درست انداز میں پیش کیا جاتا رہا وہاں کہانی میں بہت کچھ اپنی مرضی سے بھی انڈیل دیا گیا تاکہ اپنے فوری مقاصد حاصل کیے جاسکیں۔

لیکن ہدایت کار راج کمار سنتوشی کی 2002ء میں بھگت سنگھ پر بنائی جانے والی فلم اس حوالے سے مختلف ہے کہ اس میں حقائق کو بہت بہتر انداز میں پیش کیا گیا ہے اور تاریخی واقعات کی تحقیق کر کے انہیں درست انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔یہ فلم دیکھنے والوں کو نہ صرف بھگت سنگھ کے حقیقی کردار سے آشنائی ملتی ہے بلکہ یہ فلم بینوں کے انقلابی جذبات کو ابھارنے میں بھی کامیاب ہوتی ہے جو بھگت سنگھ کی جدوجہد کا بھی حتمی مقصد تھا۔اس فلم میں مرکزی کردار مشہور ایکشن ہیرو اجے دیوگن نے نبھایا ہے جبکہ سشانت سنگھ راجپوت اور دیگر اداکاروں نے بھی اپنے ہنر کے جوہر دکھائے ہیں۔اس فلم میں بھگت سنگھ کے ساتھ اس کے دیگر ساتھیوں کے کرداروں کو بھی دیگر فلموں کی طرح فراموش نہیں کیا گیا بلکہ ان کی جدوجہد اور خیالات کو بھی پیش کیا گیا ہے۔اس فلم کی موسیقی بھی انتہائی خوبصورت ہے جس میں اے آر رحمان اپنے فن کی بلندیوں کو چھوتے ہوئے نظر آتے ہیں اور تاریخی گانوں کو نئی دھنوں کے ساتھ سامنے لائے ہیں۔''میرا رنگ دے بسنتی چولا'' اور ''سرفروشی کی تمنا'' جیسے گانے بھگت سنگھ کے دور میں ہر انقلابی نوجوان کی زبان پر موجود تھے جنہیں اس فلم میں سونو نگم کی آواز میں ایک نئی زندگی عطا کی گئی ہے۔''سرفروشی کی تمنا'' کو 1921ء میں بسمل عظیم آبادی نے لکھا تھا لیکن اس کو شہرت رام پرشاد بسمل نے دی جس نے اسے انگریزوں کیخلاف آزادی کی پکار بنا دیا۔پیوش مشرا کے لکھے ڈائیلاگ کے ذریعے اس فلم میں انقلابی روح پھونکی گئی ہے۔لیکن اس فلم کی اس موضوع پر بننے والی دیگر فلموں پر برتری یہ ہے کہ اس میں گاندھی کے عوام دشمن کردار اور برطانوی سامراج کی کاسہ لیسی کو واضح انداز میں دکھایا گیا ہے۔انڈیا میں گاندھی کو سرکاری سطح پر قومی ہیرو کا درجہ حاصل ہے اور اس کو آزادی کی جدوجہد کا قائد تسلیم کیا جاتا ہے۔ایسے میں اس کے حقیقی چہرے سے نقاب اتارنا کہیں زیادہ مشکل ہو جاتا ہے جس کے لیے راج کمار سنتوشی مبارکباد کے مستحق ہیں۔

لیکن اس سے بھی اہم ترین حصہ فلم میں دکھائی جانے والی سیاسی بحثیں ہیں۔خاص طور پر بھگت سنگھ کی تقریر جس میں وہ پارٹی کے ایک اہم اجلاس میں یہ قرارداد پیش کرتا ہے کہ پارٹی کا نام ''ہندوستان ریپبلکن ایسوسی ایشن'' کی بجائے ''ہندوستان سوشلسٹ ریپبلکن ایسوسی ایشن'' ہونا چاہیے۔اس تقریر میں بھگت سنگھ بتاتا ہے کہ سوشلزم، جسے ہندی میں سماج واد بھی کہا جاتا ہے، کہ کیا معنی ہیں اور پارٹی کے نام میں اس تبدیلی سے وہ کیا مقاصد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ بھگت سنگھ پر بننے والی بہت سی فلموں اور تحریروں میں اس پہلو کو جان بوجھ کر نظر انداز کیا جاتا ہے اور اسے اس کے نظریات سے کاٹ کر صرف ایک آزادی کے لیے سرگرم سیاسی کارکن کے طور پر دکھایا جاتا ہے جو اس خطے کے حکمران طبقات کے مقاصد سے مطابقت رکھتا ہے۔حقیقت یہ ہے کہ برطانوی سامراج سے آزادی کی جدوجہد میں مختلف نظریات کے افراد، پارٹیاں، گروپ اور تنظیمیں شامل تھیں جن کے مفادات ایک دوسرے سے متصادم تھے۔کانگریس ہندوستان کی ابھرنے والی مقامی بورژوازی کی نمائندگی کرتی تھی جس کی قیادت نہرو، گاندھی اور دیگر لیڈر کر رہے تھے۔لیکن اسی دوران 1917ء کے انقلاب روس سے متاثر ہو کر سوشلزم اور کمیونزم کے نظریات بھی ہندوستان کی تحریک آزادی میں سرایت کر گئے تھے اور بڑی تعداد میں انقلابی نوجوان اور محنت کش ان کی جانب رجوع کر رہے تھے۔ان میں کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے علاوہ دیگر چھوٹے گروپ بھی موجود تھے جن میں بھگت سنگھ کی پارٹی بھی شامل تھی۔ ہندوستان میں کمیونسٹ پارٹی کی بنیاد تو 1926ء میں رکھ دی گئی تھی لیکن عوام کی وسیع پرتوں تک پہنچنے میں اسے تقریباً ایک دہائی کا عرصہ لگ گیا تھا۔اس میں بھگت سنگھ کی جدوجہد اور اس کی ساتھیوں سمیت پھانسی نے ایک اہم کردار ادا کیا تھا اور اس پھانسی کے واقعہ نے پورے ہندوستان کے انقلابی نوجوانوں اور محنت کشوں میں ایک وسیع تحریک کو جنم دیا تھا جو پورے ملک میں تیزی سے پھیل گئی تھی۔ ہر جگہ احتجاجی مظاہروں، ہڑتالوں اور تحریکوں کا آغاز ہو گیا تھا اور بھگت سنگھ آزادی پسند نوجوانوں کے دلوں کی دھڑکن بن گیا تھا۔ اسی دوران کمیونسٹ پارٹی کو بھی عوامی بنیادیں حاصل ہوئی تھیں اور اسے اپنے نظریات عوام تک لے جانے میں مدد ملی تھی۔

انقلاب
زندہ باد!

لیکن بھگت سنگھ کی زندگی کا اہم ترین حصہ اس کا آخری حصہ تھا جہاں وہ جیل میں لینن اور ٹراٹسکی کی تحریروں کا مطالعہ کر رہا تھا اور ان سے اس نے اہم نتائج اخذ کیے۔ خاص طور پر مسلح جدوجہد اور انفرادی دہشت گردی کے طریقہ کار کو رد کرنا اور سیاسی جدوجہد پر توجہ مرکوز کرتے ہوئے ایک طویل عرصے کی جدوجہد کے ذریعے انقلابی کیڈر پر مبنی پارٹی کی تعمیر پر زور ایک اہم ترین نتیجہ تھا۔ اپنی سب سے اہم تحریر ''نوجوان سیاسی کارکنان کے نام'' میں اس نے اس طریقہ کار کی وضاحت کی ہے جو آج بھی نوجوانوں کے لیے مشعل راہ ہے۔

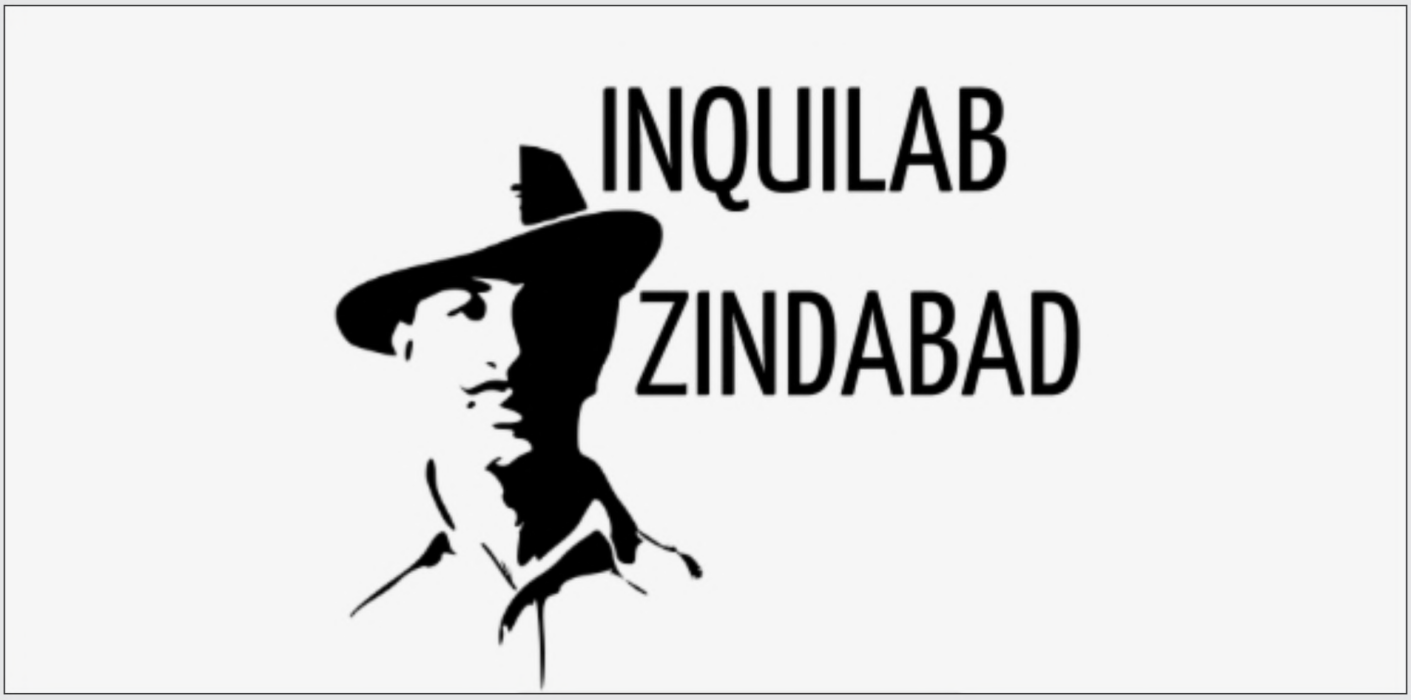

راج کمار سنتوشی نے اس فلم کا اختتام اس سین سے کیا ہے جب بھگت سنگھ لینن کی ایک اہم تصنیف ''ریاست اور انقلاب'' کا مطالعہ کر رہا تھا اور جیلر اس کو آ کر اطلاع دیتا ہے کہ اس کی پھانسی کا وقت ہوا چاہتا ہے۔ جس پر بھگت سنگھ ایک تاریخی جواب دیتا ہے کہ اس کتاب کے مطالعے کے چند صفحے رہ گئے ہیں اور وہ انہیں ختم کر کے اس کے ساتھ روانہ ہوگا۔ اسی سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ بھگت سنگھ کے لیے انقلابی نظریات کا مطالعہ اور ان کی سمجھ بوجھ حاصل کرنا کس قدر اہمیت کا حامل تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ انقلابیوں کے لیے موت کے خوف، پھانسیوں اور ریاستی جبر کی کیا حیثیت ہوتی ہے اور وہ انہیں ہنس کر سہتے ہیں۔ ایسا دیوہیکل حوصلہ اور عزم صرف اسی وقت ممکن ہے جب انسان کے سامنے زندگی کا مقصد خود زندگی سے بھی کہیں زیادہ عظیم ہو۔ بھگت سنگھ کے سامنے بھی انسانیت کی ظلم اور ناانصافی سے نجات اور سوشلسٹ انقلاب کا ہی عظیم مقصد تھا جس کے لیے اس نے اپنی زندگی قربان کر دی۔ یہ قربانی آج بھی اس عظیم مقصد کے لیے جدوجہد کرنے والوں کے لیے باعث تقلید ہے۔

یقین

(ساحر لدھیانوی)

جب دھرتی کروٹ بدلے گی جب قید سے قیدی چھوٹیں گے
جب پاپ گھروندے پھوٹیں گے جب ظلم کے بندھن ٹوٹیں گے
اس صبح کو ہم ہی لائیں گے وہ صبح ہمیں سے آئے گی

وہ صبح ہمیں سے آئے گی

منحوس سماجی ڈھانچوں میں جب ظلم نہ پالے جائیں گے
جب ہاتھ نہ کاٹے جائیں گے جب سر نہ اچھالے جائیں گے
جیلوں کے بنا جب دنیا کی سرکار چلائی جائے گی

وہ صبح ہمیں سے آئے گی

سنسار کے سارے محنت کش کھیتوں سے ملوں سے نکلیں گے
بے گھر بے در بے بس انساں تاریک بلوں سے نکلیں گے
دنیا امن اور خوشحالی کے پھولوں سے سجائی جائے گی

وہ صبح ہمیں سے آئے گی

وہ صبح ہمیں سے آئے گی

مفت تعلیم اور روزگار ہمارا حق ہے۔
طلبہ یونین بحال کرو!

JOIN PYA

مطالباتی پروگرام

1۔ ہر سطح پر مفت تعلیم کی فراہمی کو یقینی بنایا جائے۔

2۔ امیر اور غریب کے لیے الگ الگ تعلیمی نظام کا خاتمہ کیا جائے۔

3۔ تمام کالجوں اور یونیورسٹیوں میں طلبہ یونین بحال کی جائے۔
فوری طور پر یونین کے انتخابات کروائے جائیں۔

4۔ تعلیمی اداروں کے تمام اہم امور اور فیصلہ سازی میں منتخب طلبہ یونین کو
بھرپور نمائندگی دی جائے۔

5۔ طالبات کو جنسی طور پر ہراساں کرنے کے خلاف سخت ترین کاروائی کی جائے
یونین میں طالبات کی بھرپور شرکت سے اس مسئلے کا تدارک کیا جائے۔

6۔ پرائیویٹ تعلیمی اداروں کو نیشنلائز کیا جائے۔

7۔ ہر شخص کو روزگار کی یقینی فراہمی یا بیروزگاری الاؤنس دیا جائے۔

pya1917
pya1917
progressive_youth_alliance
Progressive Youth Alliance
Progressive Youth Alliance

پروگریسو یوتھ الائنس